ماہنامہ

ترجمان القرآن

جاری کردہ

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

مُدیر

خورشید احمد

ادارۂ ترجمان القرآن

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مدیر: خورشید احمد
نائب مدیر: مسلم سجاد

جلد ۱۲۴ — ستمبر ۱۹۹۷ء، جمادی الاول ۱۴۱۸ — عدد ۹

ترتیب

ادارتی امور

منصورہ، ملتان روڈ، لاہور ۵۴۵۷۰
فون: ۷۸۴۴۶۰۵
فیکس: ۷۸۴۲۱۹۴

انتظامی امور

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور
فون: ۷۵۸۷۹۹۶ - ۷۵۸۵۵۹۰

☆

قیمت فی شمارہ ۱۵ روپے
زرسالانہ ۱۵۰ روپے

بھارت -/۳۰۰
بنگلہ دیش، ایران -/۳۵۰
مشرق وسطی، یورپ،
مشرق بعید، افریقہ -/۶۵۰
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا -/۹۰۰

بنک ڈرافٹ

بنام ماہنامہ ترجمان القرآن ارسال فرمائیں

۶۰ سال پہلے

"ہجرت" کا لفظ کس قدر تمہارے لیے ناآشنا اور نامانوس ہے؟ تم سمجھتے ہو کہ یہ دنیا کے اس عہد جہل و وحشت کی یادگار ہے جب مذہبی جذبات کی برانگیختگی نے تمدنی احساسات کو مغلوب کر دیا تھا اور انسان دین پرستی کے جنون میں اپنی عقلی و تمدنی زندگی تک کو قربان کر دیتا تھا لیکن بتلاؤ، اب دنیا کی اعلیٰ سے اعلیٰ علمی و تمدنی ترقیاں بھی تم کو جس راہ کی طرف بلا رہی ہیں وہ ہجرت کی حقیقت سے کب خالی ہیں؟ اور خود علم و تمدن کا تمام ذخیرۂ عروج بھی کس عملی حقیقت کا نتیجہ ہے؟ ہجرت سے مقصود یہ ہے کہ اعلیٰ مقاصد کی راہ میں کمتر فوائد کو قربان کر دینا، اور حصول مقصد کی راہ میں جو چیزیں حائل ہوں، ان سب کو ترک کر دینا۔ خواہ آرام و راحت ہو، مال و دولت ہو، نفسانی خواہشیں ہوں، حتیٰ کہ قوم ہو، ملک ہو، وطن ہو، اہل و عیال ہوں، سب کو چھوڑ دینا۔ پھر بتلاؤ، علم و عمل کا کون گوشہ ہے جس میں کامیابی بغیر اس جذبہ کے مل سکتی ہے؟ انسان کے مطلوبات میں سے کوئی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی ایسی بتلا سکتے ہو جو بلا ہجرت کے مقام سے گزرے، اس نے پا لی ہو؟ یہ دنیا کی علمی و تمدنی ترقیاں، حیرت انگیز اکتشافات، انقلاب انگیز ایجادات، دولت کی فراوانی، تجارت کی عالمگیری، نئی نئی آبادیوں کا قیام، طرح طرح کے وسائل، معیشت و فلاح کا ظہور، پھر ملکوں کا عروج، قوموں کی بالادستی، تمدن کی وسعت، فی الحقیقت انسان کے کس عمل حق کے نتائج و ثمرات ہیں؟ اگر کج نظری چھوڑ دو تو معلوم کر لو گے کہ صرف عمل ہجرت کے...... یہ کیسی عجیب بات ہے کہ اگر صرف قطب شمالی کی تحقیق کے لیے مہاجرین کشف کے ڈیڑھ سو قافلے یکے بعد دیگرے نکلیں اور یکسر قربان و ہلاک ہو جائیں تو تم کہو کہ یہ تحقیق علم کا کمال اور جذبہ نوع پرستی کی انتہا ہے، لیکن اگر اسی چیز کو اللہ کی شریعت ایک جامع تر لفظ "ہجرت" سے تعبیر کرے تو تم اس کا انکار کر دو؟ تمہارے نزدیک یہ تو تمدن ہے کہ دریائے نیل کا مخرج دریافت کرنے کے لیے سینکڑوں انسان اپنا گھربار چھوڑ دیں اور ہلاک ہو جائیں، لیکن یہ وحشت ہے کہ قیام حق اور اشاعت صداقت کی راہ میں اللہ کے بندے ترک وطن کریں؟ اگر نیوٹن اپنی راتوں کی نیند اور بستر کی راحت چھوڑ دے تاکہ "کشش ثقل" کا قانون دریافت کر لے، تو تم اس کی پرستش کرو اور کہو کہ یہ علم پرستی ہے، لیکن اگر تم عزم و طلب کے ایسے ہی پرستار ہو تو اس عازم صادق کے لیے کیا کہتے ہو جو قانون کشش ثقل کے لیے نہیں بلکہ قانون نجات عالم کے لیے اپنا گھربار چھوڑ دیتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ حق پرستی ہے۔

(ترجمان القرآن، التزام جماعت، جلد ۱۰، عدد ۶ و جلد ۱۱، عدد ۱، اگست، ستمبر ۱۹۳۷ء/ جمادی الاخریٰ و رجب ۱۳۵۶ھ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

قومی سلامتی اور دفاع

خورشید احمد

ملت اسلامیہ پاکستان اپنی زندگی کے اولیں پچاس سال پورے کرنے کے بعد مستقبل کے سفر کے لیے ایک نیا عزم باندھ رہی ہے اور اس عہد کی تجدید کر رہی ہے جو برعظیم کے مسلمانوں نے حصول آزادی سے قبل اپنے رب اور مسلم عوام سے کیا تھا ـــــ یعنی اس پاک سرزمین پر اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ایک ایسا نمونہ پیش کرنا' جس میں اطاعت رب' باہمی اخلاص و محبت' امن و آشتی' اداے حقوق اور سب کے لیے عدل و انصاف اور حیات طیبہ کا دور دورہ ہو اور جہاں سے مسلمان ایک بار پھر حق کی شہادت دیتے ہوئے دکھی انسانیت کے لیے ایک نئے حیات بخش نظام کے پیامبر بن کر اٹھ سکیں۔ آزادی کی نعمت سے مالا مال ہو کر قوم اور اس کی قیادت نے اس عہد سے غفلت برتی اور مسلسل اس کی سزا پائی لیکن ساری کوتاہیوں اور ناکامیوں کے باوجود پاکستان کا یہی اصل تصور آج بھی دلوں کو گرم کرنے اور عزائم کو حیات نو دینے کا ذریعہ ہے:

جان فزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آ گیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگ جاں ہو گئیں

ہماری قومی سلامتی کا انحصار اس نظریے کی بنیاد پر تعمیر میں مضمر ہے اور آنے والے برسوں میں ماضی کی غلطیوں اور تباہ کاریوں سے بچنے کا ایک ہی راستہ ہے ـــــ یعنی احتساب اور مسلسل احتساب۔ جس قوم میں احتساب کا عمل جاری و ساری ہو' وہ اپنی غلطیوں کی جلد اصلاح کر لیتی ہے اور غلط کاروں کا ہاتھ روک دیتی ہے یا انھیں اختیار و اقتدار کے مقام سے ہٹا کر زمام کار مقصد اور منزل کا صحیح شعور رکھنے والوں کو سونپتی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ احتساب' جو جمہوری عمل کی روح ہے' بگاڑ اور فساد کو روکنے اور خیر اور صلاح کے فروغ پانے اور غالب آنے کا ذریعہ بنے گا۔

قومی امور پر کھلی بحث اور دلیل کے ذریعے غلط پالیسیوں کا پردہ چاک کرنا اور صحیح پالیسیوں کی تشکیل کی راہ آسان کرنا بھی اسی احتساب اور جمہوری عمل کا ایک بنیادی حصہ ہے۔ اس وقت ملک و قوم کے سامنے جو بنیادی سوالات درپیش ہیں ان میں قومی سلامتی کے حصول و استحکام میں دفاع کا مقام ایک مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ چند دوسرے امور بھی بنیادی اہمیت کے حامل ہیں جن میں (i) اسلامی نظریے کی صحیح تفہیم اور اس کے نفاذ کی حکمت عملی، (ii) معاشی ترقی کا غلط منہج اور اسلامی اصولوں اور ماضی کے تجربات کی روشنی میں نئی معاشی حکمت عملی کی تشکیل، (iii) سیاسی، انتظامی اور معاشی نظام پر ایک مخصوص اور متعین مفاد پرست طبقے کا غلبہ و اقتدار اور اس سے نجات کی راہ، (iv) تعلیم کی زبوں حالی اور نئی تعلیمی پالیسی کی تشکیل، (v) اقتدار و اختیار اور وسائل اور مواقع کی مرکزیت اور ملک کے تمام علاقوں اور طبقوں کے درمیان ان کی منصفانہ تقسیم کا فوری اور موثر انتظام اور نئے عالمی نظام اور عالمگیریت (globalisation) کے پس منظر میں نئے سامراجی خطرات اور ان کا مقابلہ کرنے کے لیے خود انحصاری پر مبنی خارجی اور داخلی پالیسیوں کی تشکیل، سرفہرست آتے ہیں اور ہم آیندہ ان پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ البتہ اس سلسلے کا آغاز ہم دفاع کے باب میں صحیح حکمت عملی اور پالیسی سے کرنا چاہتے ہیں۔ اس کی تین بنیادی وجوہ ہیں۔

اولاً: آزادی، خود مختاری اور سیاسی حاکمیت کا تحفظ، خود نظریہ پر عمل کرنے کے لیے بھی سب سے پہلی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جسم و جان کا تحفظ خود ایمان کے تحفظ کے لیے ضروری ہے۔ اگر ہماری آزادی ہی خطرے میں پڑ جائے اور اس اختیار ہی پر قدغن لگ جائے جس کے ذریعے ہم اپنے عقیدے اور عزائم کے مطابق زندگی کی تشکیل کر سکیں اور ہماری قسمت کے فیصلے دوسروں کے ہاتھ میں ہوں یا ان کے اشاروں پر کیے جا رہے ہوں تو پھر تعمیر نو کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہتا۔ جس نے کہا صحیح کہا کہ ؎

عشق و آزادی بہارِ زیست کا سامان ہے
عشق میری جان، آزادی مرا ایمان ہے
عشق پر کردوں فدا میں اپنی ساری زندگی
لیکن آزادی پہ میرا عشق بھی قربان ہے

ثانیاً: ایک مدت سے، اور بظاہر ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت دفاع کی اہمیت کو کم کرنے اور علاقائی دوستی، معاشی ترقی اور سماجی فلاح کے نام پر، جس کے لیے ایک نئی خوبصورت اصطلاح، تحفظ انسانی (Human Security) وضع کی گئی ہے، پر دفاعی وسائل میں تخفیف کے لیے ایک جارحانہ مہم چلائی جا رہی ہے اور نہایت سطحی اور جذباتی انداز میں، اصلی خطرات اور زمینی حقائق سے صرف نظر کرتے ہوئے بڑے بڑے بقراط امن کی فاختائیں بن کر شاہینوں کے پر کاٹنے کے منصوبے بنا رہے ہیں۔ مقام حیرت ہے کہ

اس شوروغوغا میں اب ان کی آوازیں بھی شامل ہو رہی ہیں جو ملک کی فضاؤں اور سرحدوں کے پاسبان رہے ہیں اور جن کو قوم نے ماضی میں ایر چیف، چیف آف سٹاف، کور کمانڈر تک کی امانتیں سونپیں۔ آج ان کی زبانوں سے بھی وہ تیر و نشتر نکل رہے ہیں جن کی زد میں شریان قیس ناتواں تک ہے۔ سابق اور حالیہ فوجی اور سیاسی قیادت کے اس آواز میں آواز ملانے سے وہ جوہری فرق واقع ہوا ہے جسے نظرانداز کر دینا بڑا مہلک ہو سکتا ہے اور اب ضروری ہو گیا ہے کہ مسئلے پر اس کے تمام پہلوؤں کو سامنے رکھ کر بات کی جائے اور قومی بحث و مجادلہ کے ذریعے صحیح فیصلے کیے جائیں۔

ثالثاً: عالمی رائے عامہ اور خصوصیت سے امریکہ، ورلڈ بنک اور آئی ایم ایف کا رویہ، جس میں ان عناصر نے کھل کر ہمارے دفاعی بجٹ کو نشانہ بنایا ہے اور سیاسی دوستی، معاشی تعاون و سرمایہ کاری اور عالمگیریت اور نج کاری کی جو قیمت وہ وصول کرنا چاہتے ہیں، وہ دفاعی اخراجات اور عسکری صلاحیت میں تخفیف اور دوستانہ ہمسائگی (friendly neighbourhood) کے نام پر علاقے میں بھارت کی بالادستی قبول کرنا ہے۔

یہ وہ وجوہ ہیں جن کی بنا پر قومی سلامتی میں دفاع کے مقام پر کھلے انداز میں گفتگو ہونی چاہیے اور تمام حقائق کی روشنی میں ایک ایسی حکمت عملی وضع ہونی چاہیے جو ملک و ملت کی آزادی اور نظریاتی، سیاسی اور معاشی خود مختاری کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو۔

آگے بڑھنے سے پہلے تین بنیادی باتوں کی وضاحت ضروری ہے: دفاع کی اہمیت اور اس کی مضبوطی و استحکام کو سیاست میں فوج کی دخل اندازی سے خلط ملط نہیں کرنا چاہیے۔ ہم اس امر کا صاف الفاظ میں اظہار ضروری سمجھتے ہیں کہ فوج کا پہلا اور آخری کام ملک کا دفاع اور ملکی دستور کے تحت اپنی ذمہ داریوں کی بجا آوری ہے۔

ماضی میں فوجی قیادت نے جن وجوہ سے بھی سیاست میں مداخلت کی، وہ ہماری نگاہ میں اصولاً غلط اور نتائج کے اعتبار سے تباہ کن رہی ہے۔ ہم تفصیلات میں جائے بغیر اور ماضی کا پوسٹ مارٹم کیے بغیر اس بنیادی بات کو واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ ہم فوج کے کسی سیاسی کردار کے ہم نوا نہیں اور اسے خود دفاع کے نقطہ نظر سے غلط اور مضر سمجھتے ہیں۔ دفاع کی مضبوطی کے بارے میں جو بات بھی ہم کہہ رہے ہیں وہ اس بنیاد پر ہے کہ فوج کو اس دستور کا مکمل طور پر پابند رہنا چاہیے جس کا وہ حلف اٹھاتی ہے اور اس سے انحراف کرنے والوں کو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ تعریف و توصیف یا عفو و درگزر کے نہیں، قرار واقعی سزا کے مستحق ہوں گے۔

دوسری بنیادی بات یہ ہے کہ دفاع کی مضبوطی اور استحکام کے معنی کسی وقت پر پائے جانے والے انتظام

و انصرام کا تحفظ نہیں۔ اس امر کی اشد ضرورت ہے کہ دنیا کے بدلتے ہوئے سیاسی حالات اور تکنیکی ترقیات، ہمارے اپنے علاقے کی صورت حال، اور ملک و ملت کی سوچ اور تاریخی روایات، ان سب کی روشنی میں دوسرے شعبوں کی طرح دفاع کے شعبے کا مسلسل جائزہ لیا جائے اور جب اور جس نوعیت کی بنیادی، تصوراتی، انتظامی، اطلاقی یا اسٹرے ٹیجک تبدیلیوں کی ضرورت ہو، وہ بروقت کی جائیں۔ ہمارا ہدف محض موجود کو مزید مستحکم کرنا نہیں بلکہ ملک کی حقیقی دفاعی صلاحیت کا استحکام اور صحیح دفاعی حکمت عملی کا فروغ ہے۔

تیسری بات جو سامنے رہنی چاہیے وہ یہ ہے کہ دفاع کے نام پر پورے دفاعی بجٹ، دفاعی پالیسی اور انتظامی مشینری کو "مقدس گائے" بنا دینے کا کوئی جواز نہیں۔ مسلم روایت اور جمہوری معاشرہ دونوں کی روشنی میں دفاعی امور کو بھی مناسب حدود کے اندر اور ضروری احتیاطوں کے ساتھ اسی طرح شوریٰ اور احتساب کی چھلنی سے گزارنا چاہیے ہیں جس طرح باقی قومی امور۔ وسائل کا بہترین استعمال اور بنیادی فیصلوں اور مالی معاملات میں شفافیت (transparancy) یہاں بھی اتنی ہی ضروری ہے، بلکہ اس سے زیادہ ضروری ہے، جتنی دوسرے شعبوں میں۔ بدعنوانی اور کرپشن کے خلاف حصار یہاں بھی اتنا ہی اہم ہے۔ پارلیمنٹ اور قوم کے سامنے جواب دہی سے کوئی مستثنٰی نہیں اور نہ ہونا چاہیے۔ اس سلسلے میں پالیسی، رویے اور طریقہ ہاے کار (processes) سب کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے اور انھیں اسلامی اصولوں اور جمہوری روایات سے ہم آہنگ کرنا بھی وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔ ہماری جستجو خوب سے خوب تر کے لیے ہونی چاہیے۔ نہ مقصد کسی کا تحفظ ہے اور نہ بے جانشانہ بازی۔

ان تینوں پہلوؤں سے حالات کا جائزہ لینے، واضح پالیسی تشکیل دینے اور ان کے مطابق اصلاح کار کی مسلسل سعی ہی ہمارے دفاعی نظام کے استحکام کی ضامن ہو سکتی ہے۔

نازی جرمن کے وزیر اطلاعات و کذبیات جنرل گوئے بلز نے کہا تھا: "ایک غلط بات کا اتنی بار اظہار و اعلان کرو کہ لوگ اسے سچ جاننے لگیں"۔ اس وقت پاکستان میں ابلاغیات کو ایک ایسے ہی عمل سے سابقہ ہے۔ ہر طرف سے یہی دھن سنائی جا رہی ہے کہ دفاع ہمارے سارے قومی وسائل کو کھائے جا رہا ہے جس کے نتیجے میں معاشی ترقی رک گئی ہے اور عام انسانوں کی فلاح و بہبود کے کام منجمد ہو گئے ہیں۔ بڑا معصوم چہرہ بنا کر کہا جا رہا ہے کہ ایک ایف ۱۶ کے بدلے اتنے اسکول اور اتنے ہسپتال بن سکتے ہیں اور ایک ٹینک کی جگہ اتنے گاؤں میں پانی پہنچایا جا سکتا ہے۔ بھارت نواز لابی تو شروع ہی سے یہ راگ الاپتی رہی ہے لیکن اب تو ورلڈ بنک اور آئی ایم ایف سے لے کر انسانی ترقی (Human Development) کے عشق کے

نوکرشاہوں تک، انسانی حقوق کمیشن کے قائدین سے لے کر فضائی اور بری فوج کے سابق سربراہ تک اسی لَے میں لَے ملا رہے ہیں حتیٰ کہ وزیراعظم صاحب نے بھی اپنے گولڈن جوبلی خطاب میں فرمادیا: "مسئلہ کشمیر پر ہونے والی جنگوں، اسلحہ کی دوڑ اور محاذ آرائی نے نہ صرف ہزاروں انسانوں کو نگل لیا بلکہ کھربوں ڈالر کے وسائل بھی دشمنی کی نذر ہو گئے۔ اس سے بھارت اور پاکستان دونوں ہی کے مفادات کو نقصان ہوا" (جنگ، لندن، ۱۵ اگست ۱۹۹۷ء)۔ وزیراعظم صاحب نے کم از کم اتنا تو کہا کہ: "مسئلہ کشمیر حل کیے بغیر امن و استحکام نہیں ہو گا اور ہم اپنے دفاع سے غافل نہیں" لیکن ایک سابق فضائی فوج کے سربراہ نے تو یہاں تک کہہ دیا اور ایک سابق کور کمانڈر اور حالیہ گورنر نے بھری بزم میں اس کی تائید کر دی کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان جنگ کا کوئی خطرہ نہیں، ۲۰ فی صد بھی اس کا خطرہ موجود نہیں اور ہمیں "بھارت کو بھی ایک ہمسایہ سمجھنا چاہیے۔ کشمیر ہماری شہ رگ نہیں ہے۔ بھارت بہت بڑی قوت ہے اور پاک فوج کشمیر آزاد نہیں کرا سکتی۔ ہمیں دفاعی فوجوں میں مسلسل تخفیف کی پالیسی اختیار کرنی چاہیے" اور بقول گورنر صاحب بہادر: ہمیں بھی نیپال اور بھوٹان کی طرح سر جھکا کر زندہ رہنے کا سلیقہ سیکھ لینا چاہیے۔ بری فوج کے ایک سابق سربراہ (جنرل گل حسن) کچھ اور بھی آگے بڑھ گئے ہیں اور نئی دہلی میں پریس ٹرسٹ آف انڈیا کو انٹرویو دیتے ہوئے دوستی کے ایسے راگ الاپنے لگے ہیں جو دو قومی نظریے اور برعظیم کی پوری تاریخ پر خط تنسیخ پھیرنے کے مترادف ہے۔ انھیں تو یہ بھی گلہ ہے کہ: "پاکستان میں نئی نسل کے سامنے شروع ہی سے بھارت ایک دشمن ملک کی حیثیت سے رکھا جاتا ہے۔ پھر بعد میں ان کا رویہ کیسے بدل سکتا ہے" (دی نیوز انٹرنیشنل، لندن، ۲۷ جون ۱۹۹۷ء)۔

یہ حضرات یہ درس بھی دے رہے ہیں کہ آج کی دنیا میں بڑا ملک چھوٹے ممالک کے خلاف جارحیت کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ بس معیار زندگی اصل چیز ہے۔ معیار زندگی بلند کرو پھر سب مسائل حل ہو جائیں گے حتیٰ کہ مسئلہ کشمیر بھی آپ سے آپ حل ہو جائے گا۔ اس فلسفہ سپردگی و تابع داری (appeasement) کے لیے سابق وزیر خزانہ اور ورلڈ بنک کے مشیر، ڈاکٹر محبوب الحق میدان میں آئے ہیں اور اپنی تقریروں اور مضامین کے علاوہ ایک بظاہر تحقیقی رپورٹ "ہیومن ڈویلپمنٹ ان ساؤتھ ایشیا ۱۹۹۷" کے توپ خانے سے دفاعی اخراجات پر حملہ آور ہوئے ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اس رپورٹ میں جنوبی ایشیا کے جن تنازعات کو امن کی راہ میں حائل رکاوٹوں کے طور پر پیش کیا گیا ہے، ان میں فرخا بیراج (بھارت۔ بنگلہ دیش) اور وولر بیراج (بھارت۔ پاکستان) کا ذکر تو موجود ہے لیکن سب سے بنیادی اور مرکزی مسئلے کشمیر کا ذکر تک نہیں ہے (ص ۹۰)۔

ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ یہ سارا کھیل کشمیر کے مسئلے سے جان چھڑانے اور پاکستان کی دفاعی

صلاحیت کو کمزور کرنے کے لیے کھیلا جا رہا ہے اور اس پر بروقت گرفت کی ضرورت ہے۔

یہ بقراط آج "ہیومن سیکورٹی" بمقابلہ "نیشنل سیکورٹی" کا درس دے رہے ہیں۔ یہ وہی حضرات ہیں جو چالیس سال سے پاکستان کی مالیاتی اور معاشی پالیسیوں کے خالق رہے ہیں، جن کے ہاتھوں ماضی کی غلط اور تباہ کن ترقیاتی حکمت عملیاں تشکیل پائیں اور ملک موجودہ مصائب کا شکار ہوا۔ اگر معاشی ترقی میں تمام مسائل کا حل ہے تو آج امریکہ اور یورپ میں مختلف تنازعات کیوں موجود ہیں؟ کیا آئرلینڈ معاشی اعتبار سے خوشحال نہیں؟ پھر وہاں ایک صدی سے خانہ جنگی کیوں ہو رہی ہے۔ کیا خوشحال ممالک کے درمیان جنگیں نہیں ہوتیں؟ کیا وسط یورپ معاشی اعتبار سے پس ماندہ تھا جو بوسنیا، کوسوو، سنجک، البانیا اور میکے ڈونیا تنازعات کا گہوارہ بنے ہوئے ہیں؟ قبرص کے بارے میں کیا خیال ہے؟ چیچنیا اور روس کے تنازعہ کی بنیاد کون سی معاشی ترقی ہے؟

پاکستان اور بھارت کے معاشی کوائف کا جو مقابلہ خود "ہیومن ڈویلپمنٹ ان ساؤتھ ایشیا ۱۹۹۷" میں دیا گیا ہے اس کی رو سے پاکستان کی فی کس آمدنی ۴۳۰ امریکی ڈالر اور بھارت کی ۳۰۰ ڈالر ہے۔ یعنی پاکستان سے ۳۳ فی صد کم۔ پاکستان کی حقیقی فی کس آمدنی کا اوسط ۲۱۶۰ ڈالر ہے جبکہ بھارت کا صرف ۱۲۴۰ ڈالر ہے یعنی پاکستان کا صرف ۶۰ فی صد --- لیکن اس نے ہمارے کون سے مسائل حل کر دیے جو مزید چند ڈالر کے اضافے سے حل ہو جائیں گے؟

پھر یہ حضرات دفاع پر اخراجات کا تو صبح و شام شور مچاتے ہیں لیکن جن مسائل نے ہمارے وسائل کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے یعنی قرضوں پر سود اور ادائیگی کا بار، اس کے بارے میں خاموش ہیں۔ دراصل یہ سودی معیشت اور قرض پر مبنی ترقی کی حکمت عملی تھی، جس کے یہ لوگ خالق ہیں اور آج بھی اس کے محافظ ہیں، جس نے معاشی ترقی کے پورے نقشے کو تہ و بالا کر دیا ہے۔ ۹۸-۱۹۹۷ کے بجٹ میں جس میں اخراجات کا تخمینہ ۵۵۲ ارب روپے ہے، کل دفاعی اخراجات کے لیے ۱۳۴ ارب روپے رکھے گئے ہیں جو سابقہ سال ۹۷-۱۹۹۶ کے اولیں بجٹ تخمینہ (۱۳۱ ارب روپے) اور نظرثانی شدہ تخمینہ (۱۲۷ ارب روپے) سے صرف ۳ اور ۷ ارب روپے زیادہ ہے اور اگر ۱۳ فی صد افراط زر کو حساب میں شامل کر لیا جائے تو حقیقی قوت خرید کے اعتبار سے ۱۱۶.۵ ارب روپے کے برابر ہو گا یعنی سال گذشتہ کے اصل تخمینہ سے ۱۲.۵ فی صد کم اور نظرثانی شدہ تخمینہ سے ۹ فی صد کم۔ اس کے برعکس سود اور قرضوں پر ادائیگی جو ۹۷-۱۹۹۶ میں ۱۹۸.۵ ارب روپے تھی جو اب ۹۸-۱۹۹۷ میں بڑھ کر ۲۴۸ ارب روپے ہے یعنی سال گذشتہ سے ۲۵ فی صد زیادہ۔ اس طرح موجودہ بجٹ کا ۴۴.۹ فی صد سود کی ادائیگی کی نذر ہو گا جبکہ دفاع کا حصہ ۲۶ فی صد سے کم ہو کر ۲۴.۲ فی صد رہ گیا ہے۔ نیز "قرض اتارو، ملک سنوارو" کے سارے خوش کن اعلانات کے باوجود قرض کا

بوجھ بڑھ رہا ہے۔ شاہد برکی کے عبوری دور میں ۲ء۱ ارب ڈالر کا قرضہ بڑھ گیا جو ۲۲ فی صد سالانہ کی ہوش اڑا دینے والی شرح پر لیا گیا تھا اور موجودہ حکومت ۶ء۱ ارب ڈالر کے اضافے کی خبر لا رہی ہے۔ یہ ہے وہ اصل ناسور جس کی وجہ سے معاشی ترقی اور انسانی خوشحالی کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا لیکن بیرونی امدادی ایجنسیوں کے ہم نوا دانش ور اس آکاس بیل کی تو کوئی فکر نہیں کرتے اور دفاع کے اخراجات کو اصل ہدف بنا رہے ہیں۔ غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ!

معیشت پر دوسرا بڑا بار بدعنوانی اور کرپشن کا ہے، جو کل قومی دولت کے ایک چوتھائی کو ہر سال ہڑپ کر جاتا ہے۔ محتاط اندازوں کے مطابق گذشتہ سالوں میں چار سو سے پانچ سو ارب روپے سالانہ کا نقصان ملک کو پہنچایا گیا ہے۔ اگر اس کے ایک تہائی کو بھی روکا جا سکے تو بجٹ کا سارا خسارہ ختم ہو سکتا ہے۔ لیکن احتساب کو ایک ڈھونگ بنا دیا گیا ہے اور ہر دور میں "بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لیے!" جو طبقہ ملک کو لوٹ رہا ہے وہی دفاع پر اخراجات کی دہائی دے رہا ہے اور ان پر نالوں کو بند کرنے کی کوئی فکر نہیں کرتا جن سے قومی دولت چند خاندانوں کو امیر تر بنانے کے لیے نکالی جا رہی ہے جو عوام کی محرومیوں کا اصل سبب ہے۔

کشمیر اور ماضی کی جنگوں کے بارے میں جو کچھ یہ حضرات فرما رہے ہیں، اس کا حقائق سے تو کوئی تعلق نہیں البتہ ان کے اصل مقاصد پر سے پردہ اٹھانے میں وہ ضرور مددگار ہیں۔

جو اس حقیقت سے انکار کرتا ہے کہ کشمیر پاکستان کی شہ رگ ہے، وہ قائداعظمؒ کی آنکھوں میں دھول ہی نہیں جھونکتا بلکہ ناقابل انکار جغرافیائی، تاریخی، سیاسی، معاشی اور اسٹرے ٹیجک حقائق سے بھی صرف نظر کرتا ہے۔ کیا پاکستان کے تمام دریا جن پر ہماری معیشت کا انحصار ہے، کشمیر سے نہیں نکلتے؟ کیا کشمیر کا فطری تعلق پاکستان سے نہیں ہے؟ کیا کشمیر اور پاکستان میں ایک ہی قوم، ایک ہی نسل اور ایک ہی دین و تہذیب کے علم بردار نہیں رہتے؟ کیا اہل کشمیر نے بھارت کے غاصبانہ قبضے کو ایک دن کے لیے بھی قبول کیا ہے؟ کیا ان کے عزائم اور امنگیں پاکستان کے بھائیوں اور بہنوں سے مختلف ہیں؟ کیا ان کی گھڑیاں بھارت کے بجائے پاکستان کے وقت کے ساتھ ہم آہنگ نہیں؟ کیا وقت گزرنے سے تقسیم ملک کا نامکمل ایجنڈا بدل گیا ہے؟ اور کیا محض قوت کے بل بوتے پر ناجائز قبضہ اور غلبہ اہل کشمیر کی جدوجہد آزادی کے علی الرغم جائز ٹھہر گیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ کشمیر اور پاکستان میں کوئی فرق نہیں ہے اور کشمیر میں پاکستان کے مستقبل کی فیصلہ کن لڑائی لڑی جا رہی ہے۔ اسے کمزور کرنے والے اور اس سے جان چھڑانے والے کشمیر سے نہیں پاکستان سے بے وفائی کے مرتکب ہوں گے۔ پاکستان کی دفاعی صلاحیت میں تھوڑی سی بھی کمی کشمیر اور پاکستان دونوں کے لیے تباہ کن ہو سکتی ہے۔ یہ وہ دام ہے جو دشمن کے جارحانہ حملے سے بھی زیادہ خطرناک ہے!

بھارت سے دوستی اور تخفیف اسلحہ کے شوق میں ہمارے یہ کرم فرما قومی وقار اور تاریخی حقائق دونوں سے صرف نظر کرنے میں بھی کوئی باک محسوس نہیں کرتے۔ فضائیہ کے ایک سابق سربراہ یہاں تک کہہ گئے ہیں کہ ماضی کی دونوں جنگیں غیر ضروری تھیں، انھیں پاکستان نے شروع کیا اور نتائج ناخوشگوار رہے۔ حالانکہ غیر جانب دار مورخ اور خود بھارت کے نسبتاً آزاد محقق اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ ۱۹۶۵ اور ۱۹۷۱ کی دونوں جنگوں میں بھارت جارحیت کا مرتکب ہوا۔ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ۱۹۶۵ میں بھارت نے رن آف کچھ میں پہل کی اور منہ کی کھائی۔ اس کے بعد بھارتی وزیراعظم لال بہادر شاستری نے اعلان کیا کہ اب بھارت اپنی پسند کا وقت منتخب کرے گا اور اپنی پسند کا نیا محاذ کھولے گا اور ۶ ستمبر کو بلااعلان لاہور کے محاذ پر اور پھر ۸ ستمبر کو سیالکوٹ کے محاذ پر اس نے حملہ کیا۔ کشمیر جو متنازع علاقہ ہے اس میں کمانڈو ایکشن کو اس کے لیے جواز نہیں بنایا جا سکتا۔ رہا ۱۹۷۱ کا معاملہ تو وہ تو اتنا واضح ہے کہ بھارت کی جارحیت پر پردہ ڈالنے کی جسارت ہمارے بڑے سے بڑے دشمن بلکہ خود بھارتی apologists تک نہیں کر سکے لیکن یہ سعادت بھی ہمارے اپنے دوستوں ہی کو حاصل ہو رہی ہے۔ صرف ریکارڈ درست کرنے کے لیے چند اہم حوالے نموتاً پیش کیے جاتے ہیں ورنہ اس سلسلے میں تاریخی شہادتیں بے شمار ہیں۔ بھارتی میجر جنرل (ر) کوقیرا بھی مایا (Koqara Bhimaya) اپنے ایک مضمون: جنوبی ایشیا میں جوہری سد جارحیت، مطبوعہ ایشین سروے جولائی ۱۹۹۶ میں لکھتا ہے:

"اپریل ۱۹۶۵ میں بھارت کی طرف سے رن آف کچھ میں جو بمبئی کے شمالی علاقے میں واقع ہے ایک چھوٹے سے بحران سے سابقہ پیش آیا۔ پاکستان کی فوجوں سے ایک معمولی چھیڑ چھاڑ ایک بڑی لڑائی کا سبب بن گئی۔ نتیجتاً پاکستانی افواج ایک بڑے حملے پر اتر آئیں جن میں بھارتی فوجیں جو تعداد میں زیادہ تھیں، پیچھے دھکیل دی گئیں اور بالآخر جنگ بندی وجود میں آئی" (ص ۶۵۳)۔

اس کے پانچ مہینے بعد جموں و کشمیر میں لڑائی شروع ہوئی اور پھر بین الاقوامی سرحد پر۔ اس کا ذکر بھارتی میجر جنرل اس طرح کرتا ہے: "وزیراعظم لال بہادر شاستری نے تیزی سے جنگ کا دائرہ پھیلانے کا فیصلہ کن اقدام کیا"۔

یعنی بھارتی وزیراعظم نے جنگ کو بین الاقوامی سرحد پر لانے کا فوری فیصلہ کیا۔

۱۹۷۱ کی جنگ کے بارے میں یہی محقق لکھتا ہے کہ اس میں فیصلہ مکمل طور پر بھارتی فوج کے ہاتھوں میں تھا۔ یحییٰ خان کا رویہ محتاط تھا لیکن پھر اس پر اندرونی دباؤ بڑھا جس کی وجہ خصوصیت سے نومبر ۲۰ تا ۲۲ کے ابتدائی بھارتی حملے تھے۔ اس کے الفاظ میں:

particularly after India's probing attacks (Nov 20-22) along the East Pakistan Border (p 655).

ایک امریکی محقق جان جی اسٹوئے سنگر (John G. Stoessinger) نے اپنی کتاب Why Nations Go to Wars میں بھارت اور پاکستان کے درمیان ۱۹۴۷ء، ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگوں کا تقابلی مطالعہ کیا ہے۔ مصنف، پاکستان اور نام نہاد مذہبی ریاست کے تصور کے خلاف ہے اور بھارت کے لیے نرم گوشہ رکھتا ہے۔ اب دیکھیے کہ وہ ان جنگوں کے بارے میں کیا کہتا ہے:

"جنگ کا آغاز ایک غیر متوقع مقام، یعنی رن آف کچھ سے ہوا... جس میں پاکستانی افواج نے بڑی تیزی سے بھارتی افواج پر فوقیت حاصل کر لی اور اس طرح اسے ایک آسان فتح حاصل ہو گئی جس نے پاکستان کو خطرناک حد تک خود اعتمادی دی جبکہ بھارت خطرناک حد تک بددلی کا شکار ہوا...... چین سے شکست کھانا ایک بات تھی، لیکن پاکستان کی عسکری فوقیت بھارت کے لوگوں کے لیے قطعاً" ناقابل قبول تھی۔ لال بہادر شاستری، جو نہرو کا جانشین تھا، سخت دباؤ میں آیا تاکہ رن آف کچھ کی شکست کا بدلہ لے سکے" (ص ۱۲۵-۱۲۶)۔

یہ ہے ۱۹۶۵ء کی جنگ کا اصل پس منظر۔ اب ذرا ۱۹۷۱ء کی جنگ کا نقشہ بھی اس امریکی محقق کے الفاظ میں دیکھ لیں:

"وسط جولائی تک مسز گاندھی کو پوری طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ پاکستان سے جنگ ریفیوجی پرابلم کے معاشی بوجھ کے مقابلے میں بہت سستا سودا ہو گی۔ ۹ اگست کو مسز گاندھی نے اپنی غیر جانب داری کی پالیسی کو ترک کر کے سوویت یونین سے ۲۵ سالہ دوستی کا معاہدہ کر لیا اور ایک طرف پاکستان کے خلاف سفارتی جنگ کا آغاز کیا۔ تو دوسری طرف خاموشی سے وہ تمام اقدام کیے جن سے بھارتی فوج کو حملہ کرنے کے لیے تیار کیا جا سکے۔ نومبر کے شروع میں بھارت کی پارلیمنٹ نے پاکستان کے خلاف قرارداد منظور کی اور اس دباؤ کے تحت مسز گاندھی نے فوجی کارروائی کا فیصلہ کیا اور بھارتی فوج کو مشرقی پاکستان کے محاذ پر پاکستانی افواج پر حملے کا اختیار دیا" (ص ۱۳۲-۱۳۳)۔

یہ تھی ۱۹۷۱ء کی جنگ کی نقشہ بندی۔ مسز گاندھی تو اتنی جری تھی کہ اس نے جارحانہ جنگ کا آغاز کرنے کے بعد صاف الفاظ میں کہا کہ:

"اگر کوئی ملک یہ سمجھتا ہے کہ ہمیں جارح قرار دے کر اپنے قومی مفادات فراموش کرنے پر مجبور کر سکتا ہے تو وہ ملک خود اپنی جنت میں رہ رہا ہے، وہاں خوش رہے" (بحوالہ لندن ٹائمز، ۳ دسمبر ۱۹۷۱ء، ص ۱۳۴)۔

یہ ہے ان دو جنگوں میں بھارت کا کردار اور ہمارے سابق فوجی اپنا ہی منہ کالا کرنے کی خدمت انجام

دے رہے ہیں۔

ع ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی ہی صورت کو بگاڑ!

قومی دفاع کے مسئلے کا انحصار خواہشات پر نہیں معروضی حقائق پر ہوتا ہے۔ ہم نے بھارت کو ہمیشہ اپنا ہمسایہ جانا ہے اور دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے لیکن نہ صرف یہ کہ بھارت نے پہلے دن سے ہمارے آزاد اور خود مختار وجود کو تسلیم نہیں کیا اور بالآخر پاکستان کو کمزور کرنے اور اپنے اندر مدغم کر کے ہمیں نیپال اور بھوٹان کی طرح اپنا ایک باج گزار ملک بنانے کا خواب ہی نہیں دیکھا بلکہ اس کے لیے ٹھوس منصوبہ بندی اور مسلسل کارروائیاں کی ہیں اور کر رہا ہے۔ جوناگڑھ، حیدر آباد اور کشمیر پر قبضہ، حکومت برطانیہ کے چھوڑے ہوئے اثاثوں کی، طے شدہ فارمولے کے مطابق، تقسیم اور ترسیل سے انکار، اندرون پاکستان سازشوں کا جال اور ہر ممکنہ کھلی اور چھپی جارحیت کا رویہ اس کا ثبوت ہے۔ اس سلسلے میں گاندھی، نہرو، پٹیل اور اچاریہ کرپلانی سے لے کر اس وقت تک کی قیادت کے رویے میں کوئی بنیادی فرق نہیں۔ کچھ نے اپنے جذبات اور عزائم کا اظہار کھلے الفاظ میں کیا ہے اور کچھ نے بات کو لپیٹ کر ادا کیا ہے۔ حتیٰ کہ ابھی گولڈن جوبلی کے موقع پر پاکستان کی آزادی کو آزادی کے بجائے تقسیم اور تباہی کے عنوان سے پیش کیا گیا ہے۔ پورا بھارتی اور مغربی میڈیا اس پر گواہ ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ جب بھارت کے دانش ور اور ڈپلومیٹ وزیراعظم سے پوچھا گیا کہ وہ پاکستان کے قیام کو ایک جائز امر تسلیم کرتے ہیں؟ تو بڑی چابک دستی سے انھوں نے فرمایا کہ اب اس کے قیام کو صحیح یا غلط قرار دینے کا وقت گزر گیا ہے۔ وہ اسے ایک امر واقعی (defacto) تو ماننے کو تیار ہیں مگر ان کے الفاظ میں امر جائز (dejuro) اب بھی تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ بلکہ لندن کے مشہور اخبار فنانشل ٹائمز نے بھارت کے پچاس سال پر جو خاص اشاعت پیش کی ہے اس میں بھارت کے ایک سابق نائب وزیر خارجہ سلمان خورشید نے تو صاف لفظوں میں لکھا ہے کہ:

"۱۹۴۷ء میں پاکستان کا نظری اور نظریاتی جواز کچھ بھی رہا ہو، بعد کے واقعات نے اس دعویٰ کو یقیناً باطل ثابت کر دیا ہے" (انڈیا انڈی پنڈنٹ ورلڈ، ص ۲۷، فنانشل ٹائمز، ۲۴ جون ۱۹۹۷ء)۔

موصوف کو یہ بھی شکایت ہے کہ پاکستان، علاقے میں بھارت سے برابری کا خواہش مند ہے اور یہی بُس کی اصل گانٹھ ہے: "افسوس ناک امر یہ ہے کہ یہ مقابلہ منفی رہا ہے۔ پاکستان بھارت کے برابر مقام کی تمنا کرتا ہے"۔

پاک بھارت تعلقات کے باب میں اس مرکزی نکتے کو سمجھنا بہت ضروری ہے کہ بھارت خود کو علاقے کا چودھری اور سوپر پاور سمجھتا ہے اور دوسرے ممالک پر بالادستی کے رشتے کو اپنے مقام کے مطابق سمجھتا ہے

جبکہ دوسرے ممالک جغرافیائی، عددی اور معاشی اعتبار سے مختلف ہونے کے باوجود اپنے مساوی مقام اور مرتبے پر سمجھوتے کے لیے تیار نہیں۔ پاکستان سے بھارت کی ناراضی کی تین مرکزی وجوہ ہیں اور جب تک ان کے بارے میں بھارت کا یا ہمارا رویہ تبدیل نہ ہو، علاقے میں خوش ہمسائیگی کا قیام ممکن نہیں۔

اولاً: وہ پاکستان کو برعظیم کا ایک جائز وارث ملک (succeeding state) نہیں سمجھتا بلکہ بھارت کا بٹوارا کرنے والا اور اس سے رشتہ کاٹ لینے والا ناخلف ملک (seceding state) سمجھتا ہے۔ جسے پاکستان اپنی آزادی سمجھتا ہے، اسے بھارت اپنے وجود کی تقسیم قرار دیتا ہے۔ جسے گاندھی جی نے بھارت ماتا کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کیے جانے سے تعبیر کیا تھا۔ یہ زہریلا ذہن آج بھی موجود ہے اور خواہ بھارتی سیاست دان اور دانش ور ہوں یا برطانوی صحافی اور اداریہ نگار، اس گولڈن جوبلی کے موقع پر سب نے دل کھول کر زہر اگلا ہے اور بھارت کی آزادی کو آزادی اور پاکستان کی آزادی کو تقسیم قرار دیا ہے۔

ثانیاً: دو قومی نظریہ جس طرح آزادی سے قبل مابہ نزاع تھا اسی طرح آج بھی اختلاف کی بنیاد ہے۔ ہمیں اس سے انکار نہیں کہ بھارت کا نظریہ اور ہمارا نظریہ مختلف ہے لیکن ہم یہ ماننے کو تیار نہیں کہ صرف بھارت کو یہ حق ہے کہ اپنے تصورات کے مطابق اپنے معاشرے اور ریاست کی تعمیر کرنے کا عزم کرے اور ہمیں یہ حق نہیں کہ ہم اپنے تصورات کے مطابق اپنے ملک کی تعمیر کریں۔ اختلاف کو معتبر(authentic) نہ سمجھنا اور دوسروں کی تہذیب اور دین و ثقافت کو حقیر جاننا اور مساوی برداشت نہ کرنا، دراصل سامراج اور امپریل ازم کی روح ہے۔ بھارت آج بھی ہمارے اس جرم کو معاف کرنے کو تیار نہیں کہ ہم اپنے دین اور اپنی تہذیب کے مطابق اپنے ملک کو تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ بقول سلمان خورشید: بھارت دو قومی نظریے کی ضد ہے اور اس نظریے کی بنیاد پر جو تقسیم عمل میں آئی ہے، اسے آج بھی وہ اور دوسرے بھارتی دانش ور اور پالیسی ساز مصنوعی قرار دیتے ہیں۔ یہ متشدد ذہن اور عدم رواداری دونوں کے درمیان اصل خلیج ہے اور ذہنوں اور دلوں کو پھاڑے ہوئے ہے۔

ثالثاً: بھارت کا یہ زعم کہ وہ ایک بڑا ملک ہے اور اسے علاقے کا لیڈر تسلیم کیا جائے اور سب اس کے خورد بن کر رہیں۔ اس کے علاقائی سلامتی کے سائے میں باج گزاروں اور ذیلی اور ظلی وجود کی تو گنجایش ہے، مساوی شرکاے کار (equal partners) کے لیے کوئی گنجایش نہیں۔ جب تک پاکستان سرتسلیم خم نہ کرے اور علاقے میں بھارت کی بالادستی قبول نہ کرے وہ اسے نیچا دکھانے اور کمزور و مجبور کرنے کی پالیسی پر عمل پیرا ہے، اور رہے گا۔

یہ ہیں وہ تین بنیادی امور جن کے بارے میں یا بھارت کا رویہ بدلے اور وہ مساوی بنیادوں پر نظریاتی و تہذیبی اختلاف کا اعتراف کرتے ہوئے دوستی اور ہمسائیگی کے تصور کو قبول کرے یا ہم اپنی آزادی اور خود

مختاری اور اپنے جداگانہ تہذیبی، سیاسی، نظریاتی اور معاشی وجود پر سمجھوتہ کرنے کو تیار ہوں--- اس کے بغیر علاقے میں امن و آشتی اور دوستی اور سلامتی کا نظام کیسے قائم ہو سکتا ہے؟

نہ وہ بدلے، نہ دل بدلا، نہ دل کی آرزو بدلی
میں کیسے اعتبار انقلاب آسماں کر لوں

بھارت کی قیادت اور اس کے پالیسی ساز دانش وروں کے ذہن اور ان کی سوچ اور منصوبہ بندی کی یہ تصویر نہ کوئی خیالی شے ہے اور نہ یہ کسی تعصب پر مبنی ہے۔ یہ حقائق کے بالکل معروضی مطالعے اور تجزیے پر مبنی ہے اور اس کی پشت پر ٹھوس تحقیقی جستجو ہے۔ جگہ کی قلت کے باعث ہم صرف چند ضروری حوالوں پر اکتفا کرتے ہیں۔ ولیم جے بارنڈز (William J. Barends) اپنی کتاب: India Pakistan and the Great Powers میں بھارت کی ابتدائی اور اساسی فکر کو یوں پیش کرتا ہے:

"مسلم لیگ کے قائدین نے جو اب پاکستان کے حکمران ہیں ایک آزاد اور متحدہ ہندستان کے خواب کو چکنا چور کر دیا۔ کتنا ہی افسوس ناک کیوں نہ ہو، یہ عملاً ناگزیر ہو گیا کہ بھارت سخت رویہ اختیار کرے۔ بھارت کے لیڈر یقین رکھتے تھے کہ پاکستان ایک قوم کی حیثیت سے باقی نہیں رہ سکے گا۔ یہی رائے بعض بیرونی مبصروں کی بھی تھی جیسا کہ نہرو نے کہا تھا: "پاکستان ایک زمانہ قدیم کی ریاست ہے جو ایک ناممکن مذہبی تصور پر قائم ہے۔ اسے ہرگز قائم نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ایسا ہرگز نہ ہوا ہوتا اگر انگریز جناح کے احمقانہ تصور کے ساتھ نہ ہو جاتے--- ہم تعاون کرنا چاہتے ہیں اور تعاون کے لیے کام کرنا چاہتے ہیں اور ایک دن ناگزیر طور پر یک جہتی ہو جائے گی، ۴ سال میں، ۵ سال میں یا ۱۰ سال میں یہ میں نہیں کہہ سکتا۔ یہ واضح نہیں ہے کہ بھارت کے سرکاری افسر دونوں ملکوں کے دوبارہ متحد ہونے کے بارے میں کیا تصور رکھتے ہیں" (ص ۵۵)۔

برطانوی مدبرین، تقسیم کے بعد ہی سے کہہ رہے تھے کہ بھارت اپنی جغرافیائی برتری کی بنا پر جنوب اور جنوب مشرقی ایشیا کے قائد کی حیثیت کے لیے کوشاں ہو گا اور "ایک ایسا وفاقی سسٹم ہی علاقے کے ممالک کے لیے سلامتی اور تحفظ کا باعث ہو گا جو بھارت کی قیادت کے تحت ہو"۔

(Nicholos Mansergh, The Common wealth and the Nations, London. 1948, p 160-161).

اخبار The Statesman کے ایڈیٹر ایان اسٹی فنس (Ian Stephens) نے اپنی کتاب Pakistan (لندن ۱۹۶۳) میں اس امر کا اظہار کیا ہے کہ بھارت کے گہرے مطالعے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ عام

ہندو کی نگاہ میں، باہم رضامندی پر بھی تقسیم ملک کے برسوں بعد بھی یہ خیال مستحکم ہے کہ پاکستان کو ایک آزاد ملک کی حیثیت سے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں (ص ۲۲۰)۔ کیتھ کیلارڈ (Keith Callard) بھی اس نتیجے پر پہنچا ہے اور اپنی کتاب Pakistan's Foreign Policy (نیویارک، ۱۹۵۷، ص ۴) میں رقمطراز ہے:

"بے شمار ہندو، پاکستان کے قیام کو اب بھی ایک فاش غلطی (tragic mistake) سمجھتے ہیں جس کا بہرصورت تدارک کیا جانا چاہیے۔ کم از کم جہاں تک مشرقی بنگال کا تعلق ہے"۔

ایک امریکی محقق، جس کا شمار بھارت کے دوستوں اور پاکستان کے ناقدین میں ہوتا ہے، یعنی سلینگ ہیری سن (Seling S. Harrison) اپنے ایک مضمون Troubled India میں جو مشہور رسالہ Foreign Affairs میں جون ۱۹۶۵ میں شائع ہوا، لکھتا ہے:

"ہندستانی قومیت کی تشکیل کے لیے ضروری ہے کہ کسی نہ کسی شکل میں برعظیم کے مسلمانوں پر ہندوؤں کی بالادستی رکھی جائے۔ بیشتر ہندو بھارتی دائرہ اثر میں ایک تابع دار پاکستان سے مطمئن ہو جائیں گے، کچھ کنفیڈریشن کی امید رکھتے ہیں اور ایک بلند آواز گروہ کسی بہانے پاکستان کو بزور طاقت ختم کرنے کو خوش آمدید کہے گا"۔

آسٹریلیا کے ایک محقق فرنے ولی (Ferone A. Vali) آسٹریلیا کی قومی یونی ورسٹی کینبرا میں ایک کانفرنس میں پیش کردہ مقالے میں کہتے ہیں:

"بھارت نہ صرف یہ کہ اپنے کو برطانوی راج کا واحد وارث سمجھتا ہے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے کو ہندو موریا اور گپتا بادشاہتوں اور مغلوں کی اسلامی سلطنت کا وارث بھی تصور کرتا ہے"۔

عملاً امریکہ بھی ایک عرصے سے بھارت کو ایک علاقائی سوپر پاور کی حیثیت دے رہا ہے۔ صدر کارٹر نے تو ۱۹۷۸ میں بھارتی پارلیمنٹ سے اپنے خطاب میں اس کا کھلا اعتراف کیا تھا۔ بعض دوسرے ممالک کھلے اعلان کے بغیر اسے عملاً یہی حیثیت دے رہے ہیں۔ روس کے زوال کے بعد، اور چین کے ایک ایشیائی عالمی طاقت بننے کے ہوتے کے پیشِ نظر امریکہ بھارت کو اپنے مہرے کے طور پر لانے کی کوشش کر رہا ہے اور بھارت اس کا پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتا ہے ورنہ جو فوجی مشینری، اور خصوصیت سے بحری بیڑا اور لمبی مار کے میزائل وہ جمع کر رہا ہے ان کا کوئی جواز دفاعی بنیادوں پر نہیں دیا جا سکتا۔ ان کی اگر کوئی توجیہہ ممکن ہے تو وہ علاقائی سوپر پاور بننے کا خواب ہے اور یہی چیز علاقے کے دوسرے ممالک اور خصوصیت سے پاکستان کے لیے سلامتی کے دور رس خطرات کو جنم دے رہی ہے۔

کیا پاکستان ان حقائق سے صرف نظر کر کے قومی سلامتی کے لیے کوئی موثر اور کامیاب دفاعی حکمت عملی بنا سکتا ہے؟ ایسا کرنا حماقت ہی نہیں، خودکشی کے مترادف ہو گا۔ (جاری)

اپنے ساتھ زیادتی کرنے والوں کو

ولیعفوا

معاف کر دینا چاہیے

ولیصفحوا

اور درگزر کرنا چاہیے۔

الا تحبون

کیا تم یہ پسند نہیں کرتے

ان یغفر اللہ لکم (النور: ۲۲)

کہ اللہ تمہیں معاف کر دے!

(خیر خواہ)

خادم انسانیت

مسلمانوں کے خیر امتہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ صرف اپنی ذات کی خدمت کے لیے پیدا نہیں ہوئے ہیں بلکہ تمام انسانیت کی خدمت ان کا مقصد وجود ہے۔ ان کے شرف کا راز اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ میں پوشیدہ ہے۔ وہ قوم پرستی یا وطن پرستی کے لیے نہیں اٹھائے گئے ہیں بلکہ یہ عین فطرت اسلام ہی کا تقاضا ہے کہ وہ خادم انسانیت بن کر رہیں۔

اب دیکھنا چاہیے کہ مسلمانوں کی وہ اصلی خدمت جس کو امر بِالْمَعْرُوْفِ وَنَہی عَنِ الْمُنْکَرِ کے جامع الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کس قسم کی خدمت ہے اور اس کی حقیقت کیا ہے۔

"معروف" لغت میں اس چیز کو کہتے ہیں جو جانی پہچانی ہو' اور اصطلاحاً" اس سے مراد ہر وہ فعل لیا جاتا ہے جس سے عقل صحیح آشنا ہو' جس کی خوبی کو فطرت سلیمہ جانتی اور سمجھتی ہو اور جسے دیکھ کر ہر انسان کا دل گواہی دے کہ واقعی یہ بھلائی ہے۔ اس کے بالمقابل "منکر" کا لفظ ہے جو عربی لغت میں ان جانی اور نامانوس چیز کے لیے بولا جاتا ہے اور اصطلاحاً" اس کا اطلاق اس فعل پر ہوتا ہے جس کو فطرت سلیمہ پسند نہ کرتی ہو' عقل صحیح جس کی برائی کا حکم لگائے' اور عام انسان جسے ناپسندیدہ سمجھتے ہوں۔ ایمانداری' سچائی' راست بازی' پرہیزگاری' فرض شناسی' ضعیفوں کی حمایت' مصیبت زدوں سے ہمدردی' مظلوموں کی مدد' محتاجوں کی اعانت' عدل و انصاف کا قیام' خدا اور بندوں کے اور خود اپنے حقوق کو سمجھنا اور انھیں ادا کرنا' یہ اور ایسے ہی دوسرے اخلاقی فضائل معروف ہیں۔ اور ان پر خود عمل کرنے اور دوسروں کو آمادہ کرنے کا نام امر بالمعروف ہے۔ اس کے برعکس خیانت' بدکاری' دروغ بافی' فتنہ پردازی' فساد انگیزی' بے انصافی' اپنے حدود سے تجاوز کرنا' دوسروں کے حق مارنا' باطل کی حمایت کرنا' حق و صداقت کو دبانا' کمزوروں اور ضعیفوں کو ستانا' یہ اور ایسے ہی دوسرے تمام خلاف انسانیت' خلاف عقل اور خلاف فطرت اعمال منکر ہیں اور ان سے خود احتراز کرنا اور دوسروں کو باز رکھنا نہی عن المنکر ہے۔

اس میں خود نیک بننا اور بدی سے پرہیز کرنا مقدم رکھا گیا ہے اور نیک بنانا اور بدی سے روکنا موخر' جیسا کہ امر بِالْمَعْرُوْفِ وَنَہی عَنِ الْمُنْکَرِ سے پہلے اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ کا ذکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ نیک بنانے سے پہلے نیک بننا ضروری ہے۔ لیکن جس طرح اپنا پیٹ بھرنے سے دوسرے کا پیٹ بھرنا زیادہ افضل ہے۔ اسی طرح فضیلت کے اعتبار سے نیکی کو پھیلانے اور بدی کو روکنے کا درجہ بھی نیک بننے اور بدی کو ترک کرنے سے زیادہ ہے۔ کیونکہ ایک اپنی خدمت ہے' اور دوسری

اپنے ابنائے نوع کی خدمت۔ ایک محض انسانیت کے درجے میں ہے اور دوسری انسانیت کاملہ کے درجے میں۔ نیکی پر خود عمل کرنا اور بدی سے خود پرہیز کرنا یقیناً ایک اچھی صفت ہے اور ایک شریف آدمی کا شیوہ، مگر شرافت کا کمال اور بزرگی کا اعلیٰ درجہ اس وقت تک کسی انسان کو نصیب نہیں ہو سکتا جب تک وہ دوسرے لوگوں کو بھی نیکوکار بنانے اور بدکاری سے روکنے کی کوشش نہ کرے۔ انسان کی فطرت ہے کہ اگر اسے کوئی چیز ناپسند ہوتی ہے تو چھوڑ دیتا ہے۔ اگر ناپسندی سے ایک درجہ بڑھ کر نفرت ہوتی ہے تو اسے دیکھنا یا سننا بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ اگر نفرت سے ایک درجہ بڑھ کر دشمنی ہو جاتی ہے تو وہ اسے مٹانے کے درپے ہو جاتا ہے۔ اور اگر دشمنی سے بھی بڑھ کر اس کے دل میں بغض و عناد کے شدید جذبات پیدا ہو جاتے ہیں تو پھر وہ اس کے مٹانے کو اپنی زندگی کا مشن بنا لیتا ہے اور اس طرح ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ جاتا ہے کہ جب تک اسے صفحہ ہستی سے محو نہ کر دے، چین نہیں لیتا۔ اسی طرح جب وہ کسی چیز کو پسند کرتا ہے تو خود اختیار کر لیتا ہے۔ جب محبت کرتا ہے تو آنکھوں سے اس کو دیکھنے اور کانوں سے اس کا ذکر سننے میں مسرت محسوس کرتا ہے۔ جب محبت سے بڑھ کر عشق کا درجہ آتا ہے تو چاہتا ہے کہ دنیا کے ذرے ذرے میں اسی کا جمال ہو اور زندگی کا کوئی لمحہ بھی اس کے غیر کو دیکھنے اور غیر کا ذکر سننے اور غیر کا تصور کرنے میں ضائع نہ ہو۔ پھر اگر یہ عشق فدائیت کی حد تک بڑھ جائے تو وہ اپنی زندگی کو اسی کی خدمت کے لیے وقف کر دیتا ہے اور اپنی جان و مال، عیش و آرام، عزت و آبرو، غرض سب کچھ اس پر نثار کر دیتا ہے۔ امر بِالْمَعْرُوْفِ جس چیز کا نام ہے وہ دراصل نیکی سے انتہائی شیفتگی اور والہانہ عشق ہے، اور نَھی عَنِ الْمُنْکَرِ سے جس چیز کو تعبیر کیا گیا ہے وہ دراصل بدی سے انتہائی بغض و عناد ہے۔ مَعْرُوْف کا حکم دینے والا صرف نیک ہی نہیں ہوتا بلکہ نیکی کا عاشق اور فدائی ہوتا ہے، اور منکر سے روکنے والا صرف بدی سے محترز ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کا دشمن اور اس کے خون کا پیاسا ہوتا ہے۔

ایک دوسرا جذبہ جس پر اَمر بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھی عَنِ الْمُنْکَر کی بنیاد قائم ہے، حب انسانیت اور ہمدردی بنی نوع کا جذبہ ہے۔ خود غرض آدمی کو اللہ جو نعمت دیتا ہے، اس میں وہ اکیلا رہنا چاہتا ہے، دوسرے کو اس میں شریک نہیں کرتا۔ اسی طرح کوئی مصیبت اس کی اپنی ذات پر آئے تو وہ اسے دفع کرنے کی پوری کوشش کرتا ہے مگر دوسروں کو مصیبت میں دیکھ کر ان کی مدد نہیں کرتا۔ بخلاف اس کے جو شخص ہمدرد اور محب انسانیت ہو، وہ اپنی راحت میں سب کو شریک کرتا ہے، اپنی نعمتیں سب پر بانٹتا ہے، اور دوسرے کو درد و مصیبت میں دیکھ کر اسی طرح بیتاب ہو جاتا ہے جس طرح خود اپنے لیے ہو سکتا ہے۔ اس خود غرضی و ہمدردی کو ہم عموماً محسوسات اور مادیات کے عالم تک محدود سمجھتے ہیں۔ لیکن اخلاق و روحانیت کے عالم میں ان صفات کا مقابلہ زیادہ سختی کے ساتھ ہوتا ہے، اور چونکہ انسان کی مادی بھلائی اور برائی اس کی اخلاقی و روحانی زندگی کے تابع ہوتی ہے اس لیے ان صفات کا اصلی مقابلہ حقیقتاً اسی عالم میں ہوتا ہے۔ ایک سچا ہمدرد بنی نوع اور محبِ انسانیت خود نیک بن جانے پر قانع نہیں ہو سکتا۔ جب تک وہ اپنی انسانی برادری کے

دوسرے افراد کو بھی بدی کے پنجہ سے چھڑا کر نیکی کا رستہ نہ دکھائے' اسے اطمینان نصیب نہیں ہوتا۔ اس کی روح اپنے دوسرے بھائی کو بدی میں مبتلا دیکھ کر بے چین ہو جاتی ہے۔ وہ دوسرے انسان کو نیکی کے لباس سے عاری دیکھ کر اسی طرح بے قرار ہو جاتا ہے جیسے کوئی ماں اپنے بچے کو سردی میں سکڑتے دیکھ کر بے قرار ہو جایا کرتی ہے۔ اس کو جب کسی چیز کی اچھائی معلوم ہو جاتی ہے تو اس کا جی چاہتا ہے کہ سارے انسان اس سے فائدہ اٹھائیں' اور جب وہ کسی چیز کی برائی جان لیتا ہے تو وہ چاہتا ہے کہ اس کے چنگل میں ایک شخص بھی گرفتار نہ رہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ ایک چیز اگر اچھی ہے تو وہ صرف میرے ہی لیے اچھی نہیں ہے بلکہ ہر انسان کے لیے اچھی ہے اور میرا فرض ہے کہ اس کو آدم کے ہر بیٹے اور بیٹی تک پہنچاؤں۔ دوسری چیز اگر فی الحقیقت بری ہے تو وہ صرف میرے ہی لیے بری نہیں ہے بلکہ سب کے لیے اس کی برائی یکساں ہے اور لوگوں کو اس سے بچانا میرا فرض ہے۔ اپنی بھلائی پر قناعت کر کے دوسروں کی بھلائی نہ چاہنا اور اپنے سے بدی کو دور کر کے مطمئن ہو جانا اور دوسروں کو اس سے بچانے کی کوشش نہ کرنا' سب سے بڑی خود غرضی اور سب سے بڑی انانیت ہے۔

لیکن یہ صرف خود غرضی ہی نہیں بلکہ خودکشی بھی ہے۔ انسان ایک متمدن ہستی ہے۔ وہ جماعت سے الگ ہو کر زندگی نہیں بسر کر سکتا۔ اس کی بھلائی اور برائی سب کچھ اجتماعی ہے۔ جماعت بری ہو گی تو اس کی برائی سے وہ بھی نہ بچ سکے گا۔ اگر ایک شہر میں عام طور پر غلاظت پھیلی ہوئی ہو اور اس سے وبا پھوٹ پڑے تو ہوا کی خرابی صرف اسی شخص کو ہلاک نہ کرے گی جس کے گھر میں غلاظت موجود ہو' بلکہ وہ صاف ستھرا روز نہانے والا' روز گھر کو صاف کرنے والا' اور حفظانِ صحت کا پورا لحاظ رکھنے والا آدمی بھی اُس سے متاثر ہو گا جو اس شہر میں رہتا ہو۔ اسی طرح اگر کسی بستی کا عام اخلاق بگڑا ہوا ہو اور وہاں کے لوگ عموماً بدکار ہوں تو اس پر جو تباہی نازل ہو گی' وہ صرف بدکاروں ہی تک محدود نہ رہے گی بلکہ ان چند نیکوکاروں کی عزت و شرافت پر بھی اس کی زد پہنچے گی جو اس بستی میں مقیم ہوں۔ وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاۤصَّةً (الانفال ۸:۲۵) کے یہی معنی ہیں کہ کسی بستی کی عام تباہی سے صرف بدکار ہی تباہ نہیں ہوتے بلکہ نیکوکار بھی اس کی لپیٹ میں آ جاتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مضمون کو ایک حدیث میں نہایت وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے: "اللہ عام لوگوں پر خاص لوگوں کے عمل کے باعث اس وقت تک عذاب نازل نہیں کرتا جب تک ان میں یہ عیب پیدا نہ ہو جائے کہ اپنے سامنے برے اعمال ہوتے دیکھیں' اور انھیں روکنے کی قدرت رکھتے ہوں مگر نہ روکیں۔ جب وہ ایسا کرنے لگتے ہیں تو پھر اللہ عام اور خاص سب پر عذاب نازل کرتا ہے" (مسند احمد)۔

پس اَمر بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهی عَنِ الْمُنْكَر صرف دوسروں ہی کی خدمت نہیں بلکہ اپنی خدمت بھی ہے اور درحقیقت مجموعی بہتری میں اپنی بہتری چاہنے کی دانش مندانہ حکمت عملی کا دوسرا نام ہے۔ (الجہاد فی الاسلام)

اللہ ہی سے مانگنا

مولانا عبدالمالک

حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے' فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے ابن آدم جب تک تو مجھ سے دعا کرتا رہے گا اور مجھ سے امید لگائے گا میں تیری مغفرت کر دوں گا۔ جو بھی تیرے اعمال ہوں میں اس کی پروا نہ کروں گا۔

اے ابن آدم تو اگر میرے پاس اتنی خطائیں لے کر آئے کہ ان سے زمین بھر جائے' پھر مجھ سے اس حال میں ملے کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا ہو' تو میں تیری اتنی مغفرت کروں گا کہ اس سے پوری روئے زمین بھر جائے۔ (ترمذی)

● مغفرت کے بڑے اور اہم سبب تین ہیں۔ ا۔ دعا کرنا۔ یہ بات اللہ کے شایان شان نہیں کہ وہ کسی کے لیے دعا کا دروازہ تو کھول دے لیکن قبولیت کا دروازہ بند کر دے۔ یعنی دعا کی توفیق' قبولیت دعا کی علامت ہے۔ ۲۔ قبولیت کی امید اور یقین رکھنا۔ اللہ تعالیٰ ایسے دل سے دعا قبول نہیں کرتا جو غافل ہو اور یکسوئی کے ساتھ دعا کرنے والا نہ ہو۔ ۳۔ دعا کرتا رہے دعا کو چھوڑے نہیں۔ دعا کو چھوڑ دینا قبولیت دعا میں مانع ہے۔ مثل مشہور ہے جو دروازہ کھٹکھٹاتا ہے' قریب ہے کہ اس کے لیے دروازہ کھول دیا جائے۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے: تم دعا سے عاجز نہ ہو جاؤ اس لیے کہ دعا کے ساتھ ہلاکت نہیں ہے۔

● اصل دعا آخرت کی کامیابی' جنت میں داخلے اور دوزخ سے بچاؤ کے لیے کرنا چاہیے۔ یہی زندگی کا اصل مقصد ہے۔ استغفار کے یہی معنی ہیں کیونکہ استغفار گناہوں سے ہوتا ہے۔ اور گناہ ہی دخول جنت میں مانع اور دخول نار کا سبب ہوتے ہیں۔ کسی کے گناہ کتنے بھی زیادہ کیوں نہ ہوں' اللہ کی مغفرت ان پر حاوی ہے اور سب کو اپنے احاطے میں لے سکتی ہے۔ اللہ کی مغفرت کی وسعتوں کے مقابلے میں بندے کے گناہ کچھ بھی نہیں۔

● حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کہتے ہوئے آیا: "ہائے میرے گناہ' ہائے میرے گناہ"۔ اس نے دو یا تین مرتبہ ایسا کہا تو آپؐ نے فرمایا: اس طرح سے نہ کہو بلکہ یوں دعا

کرو: "اے اللہ تیری مغفرت میرے گناہوں کے مقابلے میں زیادہ وسعت رکھتی ہے۔ اور تیری رحمت سے مجھے اپنے عمل کے مقابلے میں زیادہ امیدیں ہیں" تو اس نے اس طرح سے کہہ دیا۔ آپؐ نے فرمایا: اسے پھر دہراؤ تو اس نے پھر ان کلمات کو دہرایا۔ اس پر آپؐ نے فرمایا: جاؤ اللہ نے تیری مغفرت فرما دی۔

● مغفرت ان کے لیے ہے جو پریشان ہو کر تائب ہو جائیں اور صدق دل سے دعا کریں۔ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص گناہ سے توبہ کرے وہ اس آدمی کی طرح ہو جاتا ہے جس نے کوئی گناہ نہ کیا ہو۔ جو گناہ پر قائم رہتے ہوئے استغفار کرتا ہو، وہ اپنے رب سے استہزا کرنے والے کی طرح ہے۔ (ابن ابی الدنیا)

○

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے: فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

یقیناً اللہ تعالیٰ پاک ہے، نہیں قبول کرتا مگر پاک چیز کو۔ یقیناً اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو وہ حکم دیا ہے جو پیغمبروں کو دیا ہے کہ: "اے رسولو! کھاؤ پاکیزہ چیزوں سے اور عمل کرو نیک"۔ اور فرمایا اللہ تعالیٰ نے: "اے ایمان والو! کھاؤ پاکیزہ چیزوں سے جو ہم نے تمھیں دی ہیں اور اللہ کا شکر ادا کرو اگر تم اسی کی عبادت کرتے ہو"۔ پھر آپؐ نے ذکر کیا کہ ایک آدمی لمبا سفر کرتا ہے، وہ پراگندہ بال والا اور غبار آلود ہے۔ اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے کہتا ہے: یارب! یارب! لیکن اس کا کھانا حرام ہے، پہننا حرام، اسے حرام غذا دی گئی ہے۔ تب کیسے اس کی دعا قبول کی جائے گی۔ (مسلم شریف)

● کچھ اوصاف دعا کی قبولیت کا تقاضا کرتے ہوں اور کچھ قبولیت سے مانع ہوں تو ایسی صورت میں اگر مانع مضبوط اور قوی ہو تو اسباب قبولیت غیر موثر ہو جاتے ہیں اور دعا قبول نہیں ہوتی۔ اسباب قبولیت میں سفر، اور عاجزی اور انکساری ہے۔ بال بکھرے ہوئے ہوں، جسم غبار آلود ہو، مسافرت کی حالت ہو تو ان کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ کی رحمت جوش مارتی ہے اور دعا قبول ہوتی ہے۔ لیکن دوسری طرف رزق حرام اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت دیتا ہے۔ رزق حرام، چوری، ڈاکے، خیانت اور رشوت کا ہو تو یہ ظلم ہے بندوں پر، اور اگر بذات خود اس کا استعمال حرام تھا، مثلاً خنزیر، مردار، اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ کی قسم سے: تو یہ اللہ تعالیٰ کی حق تلفی ہے اور ظلم ہے۔ ظلم قبولیت دعا سے مانع ہے۔ اور یہ مانع اسباب قبولیت کے مقابلے میں زیادہ قوی ہے، اس لیے کہ رزق ایسی چیز ہے کہ انسان کی ساری قوت اس پر مبنی ہوتی ہے۔ اس کے دل و دماغ اور جسم و اعضا کی صلاحیتیں اور حرکتیں اور کارکردگی سب رزق پر موقوف ہیں۔ اگر رزق حلال ہے تو یہ ساری چیزیں حلال بنیاد پر متحرک ہیں اور رزق حرام ہے تو پھر یہ ساری چیزیں حرام بنیاد پر چل رہی ہیں۔ ایسی صورت میں وہ عبادت، وہ نیکی، وہ تقویٰ، وہ تبلیغ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور وہ دعا کیسے قبول ہو سکتی ہے جس کی روح اور بنیاد رزق حرام ہے۔ پھر بھلا ایسے شخص کی دعا کو کیسے قبول کیا جائے گا!

● حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تلاوت کی گئی: يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا "لوگو کھاؤ زمین کی حلال اور پاکیزہ چیزیں" تو سعد بن ابی وقاصؓ کھڑے ہو گئے اور عرض کیا یارسول اللہ! میرے لیے دعا کیجیے کہ میں "مستجاب الدعوۃ" ہو جاؤں، تو آپؐ نے فرمایا: سعد، حلال اور پاکیزہ کھانا کھایا کرو، مستجاب الدعوۃ ہو جاؤ گے۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں محمدؐ کی جان ہے، آدمی حرام لقمہ اپنے پیٹ میں ڈالتا ہے تو اللہ تعالیٰ چالیس دن اس کے کسی عمل کو قبول نہیں کرتے، اور جس آدمی کا گوشت حرام پر پلا ہو تو آگ اس کے لیے زیادہ سزاوار ہے۔ (طبرانی)

○

حضرت ابو امامہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حجتہ الوداع میں خطبہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا۔ آپؐ نے فرمایا: اپنے رب سے، تقویٰ اختیار کرو، اپنی پانچ نمازیں پڑھو، اپنے مہینے کے روزے رکھو، اپنے مالوں کی زکوٰۃ دو۔ اپنے صاحب امر لوگوں کی اطاعت کرو۔ داخل ہو جاؤ گے اپنے رب کی جنت میں"۔ (ترمذی، ابن حبان، احمد)

● جنت میں داخلہ اللہ تعالیٰ کی بندگی کے میدان میں کامیابی سے ہوتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کسی ارشاد میں اگر بندگی کے چند کاموں کا ذکر کیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ان کاموں کو بندگی رب کے تمام شعبوں میں کامیابی سے ہمکنار کرنے میں دخل ہے۔

● دوسری احادیث کی طرح اس حدیث میں بھی "تقویٰ" کو سرفہرست رکھا گیا ہے جس کے معنی ہیں: زندگی کے تمام شعبوں میں اللہ تعالیٰ کے احکام اور فرامین کی تعمیل کرنا اور صغائر و کبائر سے بچنا۔ اس کے بعد نمازوں، روزوں اور زکوٰۃ کا ذکر کیا جن سے انفرادی اصلاح کی توفیق مل جائے گی اور اجتماعی کاموں کے لیے استعداد بھی پیدا ہو جائے گی۔ "اصحاب امر کی اطاعت" کا بھی مختلف احادیث میں بطور خاص ذکر کیا گیا ہے، کہیں اعمال میں اخلاص کے ساتھ اور کہیں تقویٰ کے ساتھ۔ یعنی عبادت صرف نماز، روزے اور زکوٰۃ کا نام نہیں ہے بلکہ اسلام کے اجتماعی نظام کو قائم رکھنے اور قائم کرنے کے لیے اصحاب امر کی اطاعت بھی ضروری ہے، اور اس سے جنت میں داخلے کی راہ ہموار ہوتی ہے۔

○

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اللہ تعالیٰ کو تمام لوگوں سے بڑھ کر مبغوض تین آدمی ہیں: ایک وہ جو حرم میں کج روی اختیار کرے، دوسرا وہ جو اسلام میں جاہلیت کے طریقے کی طلب کرے، تیسرا وہ جو ایک مسلمان آدمی کے خون ناحق کو گرانے کی خواہش رکھتا ہو۔ (بخاری شریف)

● حرم روئے زمین کا مقدس ترین علاقہ ہے۔ اگر ایک شخص ایسی جگہ میں بھی خدا کو بھلا دے اور کج روی

اختیار کرے تو دنیا کے کسی دوسرے علاقے میں برائی سے کس طرح اپنے آپ کو بچائے گا۔ جو آدمی مسلمان ہو کر بھی جاہلی نظام، اس کے کسی حصے کی چاہت رکھتا ہو، تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے پاک اور عمدہ کھانے کے ہوتے ہوئے کوئی شخص گندگی چاٹنے کی خواہش رکھتا ہو۔ یہ برائی کی چاہت میں بہت آگے بڑھ چکا ہے، اس کا مزاج بگڑ چکا ہے، لہٰذا یہ اللہ کے ہاں دوسرے تمام لوگوں سے بڑھ کر مبغوض ہے۔ وہ جو مسلمان کے ناحق خون کو گرانے کے درپے ہے، اللہ کو سب سے بڑھ کر مبغوض ہے اس لیے کہ اسلام میں عصمت جان کا سب سے اونچا درجہ ہے۔ اگر اس شخص کے خنجر سے ایک مسلمان بھی محفوظ نہیں ہے تو یہ درندگی میں بہت آگے نکل چکا ہے۔

● ہمارے معاشرے میں اللہ کے نزدیک مبغوض کاموں میں مصروف لوگوں کی کمی نہیں ہے۔ ہمیں اپنا جائزہ لینا چاہیے۔

○

حضرت جابر بن سلیمؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اللہ سے تقویٰ اختیار کرو، اور تھوڑے بھلے کام کو بھی حقیر نہ سمجھو اگرچہ وہ اس شکل میں ہو کہ آپ اپنے ڈول سے پانی مانگنے والے کے برتن میں پانی ڈال دیں۔ تکبر سے بچو کہ اللہ تعالیٰ تکبر کو پسند نہیں کرتا۔ اگر کوئی آپ کو گالی دے اور کسی ایسے عیب کی وجہ سے عار دلائے جو اس کے علم میں تیرے اندر پایا جاتا ہے تو تم اسے کسی ایسے عیب کی وجہ سے عار نہ دلاؤ جو تمھارے علم میں اس کے اندر پایا جاتا ہے۔ تمھیں اس کا اجر ملے گا، اور اسے اس کا گناہ ہو گا۔ اور کسی کو گالی نہ دو۔ (مسند احمد)

○

حضرت ابو امامہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسولؐ اللہ! ایمان کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا:

جب تجھے تیری نیکی خوش کرے اور تیری برائی غمگین کر دے تو، پھر تو مومن ہے۔ (مسند احمد، ابن حبان، مستدرک حاکم)

● ایمان تقاضا کرتا ہے کہ انسان نیکی کرے اور برائی سے بچے، جس طرح ایک تاجر کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ منافع کمائے اور نقصان سے بچے۔ اگر تاجر نفع نہ کمائے بلکہ خسارے سے دوچار ہو تو وہ یقیناً غمگین ہوتا ہے۔ اور نقصان بہت زیادہ ہو جائے تو بعض اوقات اسے دل کا دورہ پڑ جاتا ہے۔ پس اگر ایک تاجر نفع کما کر خوش نہ ہو، نقصان اٹھا کر غمگین نہ ہو تو اس کا معنی یہ ہے کہ اس نے تجارت کو سمجھا ہی نہیں ہے۔ اگر ایک مومن نیکی کر کے خوش نہیں ہوتا، برائی میں مبتلا ہو جانے کی صورت میں غمگین نہیں ہوتا، اس میں یا تو ایمان نہیں ہے یا اس کا ایمان مردہ ہو چکا ہے۔

کلامی مسائل میں مولانا مودودیؒ کا مسلک

ڈاکٹر عبدالحق انصاری

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمتہ اللہ نے موجودہ دور میں اسلامی فکر کے احیا کے لیے جو تحریری کام کیا ہے اور اسلامی نظام زندگی کے قیام کے لیے جو تحریک چلائی ہے' دونوں ہی میدانوں میں ان کا کام اس صدی کا تجدیدی کام ہے اور مولانا کا شمار بجا طور پر مجددین امت کی فہرست میں کیا جائے گا۔ بعض امور میں مولانا' امام غزالیؒ' ابن تیمیہؒ اور شاہ ولی اللہؒ کی صف میں شانہ بشانہ کھڑے نظر آتے ہیں' بعض امور میں ان سے پیچھے اور بعض میں ان سے آگے۔

ان بزرگوں کی ایک مشترک خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے پورے دین کا ایک انتہائی مربوط اور جامع تصور پیش کیا۔ امام غزالیؒ کی "احیاء علوم الدین" اور شاہ ولی اللہؒ کی "حجۃ اللہ البالغہ" اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔ علامہ ابن تیمیہؒ کی تصانیف میں کوئی کتاب ایسی نہیں جو "احیاء العلوم" اور "حجۃ اللہ البالغہ" کے طریقے پر ایک جامع تصنیف کی جائے لیکن دین کا شاید ہی کوئی پہلو ایسا ہو جس پر انھوں نے قلم نہ اٹھایا ہو اور اس پر سیر حاصل بحث نہ کی ہو۔ ان کی تصانیف کا سرسری مطالعہ کرنے والا بھی یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ امام کے سامنے پورے دین کا واضح تصور تھا اور وہ اسی کے احیا کے لیے کوشاں تھے۔ یہی حال مولانا مودودیؒ کا ہے۔ ان کی کتابوں میں بھی کوئی ایک کتاب "احیاء العلوم" یا "حجۃ اللہ البالغہ" جیسی نہیں ہے لیکن انھوں نے بھی دین کے ہر پہلو پر لکھا اور پورے دین کا جامع نقشہ انتہائی مرتب طریقے پر پیش کیا اور اسی کی اقامت کے لیے تحریک چلائی۔

جن پہلوؤں میں مولانا کا کام ان بزرگوں کے کام کے مقابلے میں فروتر ہے' وہ اسلام کے بنیادی تصورات کی تشریح اور ان کے مقابل نظریات کی تنقید اور تردید ہے۔ اس میدان میں ان بزرگوں کے کام میں جو فلسفیانہ گہرائی اور تجزیہ و تحلیل ہے' مولانا کے یہاں وہ نہیں ملتی۔ مثال کے طور پر امام غزالیؒ نے "تہافتہ الفلاسفہ" میں اپنے دور کے فلسفیانہ نظریات پر جس طرح کی تنقید کی ہے' یا "الاقتصاد فی الاعتقاد" میں اسلامی عقائد کی جس ڈھنگ سے تشریح کی ہے یا ابن تیمیہؒ نے "درء تعارض العقل والنقل" اور

"منھاج السنتہ" میں مخالف منطقی فلسفیانہ اور کلامی نظریات پر جو تنقید کی ہے اور شاہ ولیؒ اللہ نے "خیر کثیر" اور "بدور بازغہ" میں اسلامی تصورات کی عمارت جن بنیادوں پر اٹھائی ہے، ایسی کوشش مولانا کے یہاں نہیں ملے گی۔

مگر مولانا نے بعض دوسرے میدانوں میں ان بزرگوں سے زیادہ وقیع خدمات انجام دی ہیں، مثلاً اسلام کی اجتماعی فکر کی جیسی تشکیل مولانا نے کی ہے، اسلام کے معاشرتی، معاشی اور سیاسی نظام کو جس تفصیل سے پیش کیا ہے اور اس کے دفاع اور تائید میں جو دلائل فراہم کیے ہیں اور ان کے مقابل مغربی افکار و نظریات، قدروں اور نظاموں پر جو تنقید کی ہے، وہ آپ اپنی مثال ہے۔

ایک دوسرا میدان، قرآن مجید کی تفسیر کا ہے۔ امام غزالیؒ کے ہاں اس میدان میں کوئی کام نہیں۔ اس سلسلے میں ان کی کتاب "المقصد الاسنی فی شرح اسماء اللہ الحسنیٰ" کا ذکر کیا جا سکتا ہے لیکن وہ صرف اسماء الہیہ کی تشریح ہے۔ امام ابن تیمیہؒ نے سورہ اخلاص اور مختلف سورتوں اور آیتوں کی تفسیر کی ہے جس کا مجموعہ "تفسیر ابن تیمیہ" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے لیکن امام موصوف کی کوئی مستقل تصنیف تفسیر میں نہیں ہے۔ شاہ ولی اللہؒ نے اصول تفسیر میں "الفوز الکبیر" لکھی اور "الفتح المنیر" مرتب کی اور قرآن مجید کا ترجمہ کیا ہے۔ مولانا مودودیؒ کی "تفہیم القرآن" تفسیر میں ایک عظیم کاوش ہے۔ ایک نئے انداز سے قرآن مجید کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش ہے۔ موجودہ دور میں انسانی زندگی کے مختلف علمی اور عملی مسائل میں قرآن مجید کی رہنمائی کی وضاحت اور قرآن مجید سے متعلق سوالات جو آج ذہن میں اٹھتے ہیں اور مختلف اعتراضات جو مستشرقین نے اٹھائے ہیں، ان سب کا تشفی بخش جواب دینے میں مولانا کی یہ کوشش منفرد اور بے مثال ہے۔

مولانا کا تیسرا کام جس کی تفصیل و توضیح ان بزرگوں کے یہاں نہیں ملتی، وہ وحی و نبوت کے تصورات کی وضاحت اور انبیا و رسل کے مشن کی تفسیر و تقریر ہے، بالخصوص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے تاریخ ساز کارناموں کا تعارف، اسلامی قانون و شریعت میں سنت کے مقام کی وضاحت اور حدیث کی قدر و قیمت گھٹانے یا اس کی تضعیف و انکار کی کوششوں کی تنقید و تردید۔

مولانا کا چوتھا کام اسلامی نظام زندگی کی دعوت، شہادت اور اقامت کے لیے ایک تحریک کا برپا کرنا ہے۔ اس میدان میں وہ ان تمام بزرگوں سے آگے نظر آتے ہیں۔ امام غزالیؒ کے کام سے متاثر ہو کر ان کے ایک شاگرد ابن تومرت نے شمالی افریقہ میں تحریک شروع کی لیکن خود امام نے کوئی تحریک نہیں اٹھائی۔ امام ابن تیمیہؒ نے بذات خود حکومت اسلامیہ کے دفاع میں جہاد کیا اور چند ساتھیوں کے ساتھ امر بالمعروف کے فریضے کو ادا کرنے کی کوشش کی لیکن انھوں نے کوئی اسلامی تحریک منظم نہیں کی۔ یہی حال حضرت شاہ ولیؒ اللہ کا

ہے۔ شاہ صاحب کی احیاے دین کی علمی کوششوں سے متاثر ہو کر آپ کے خانوادے اور معتقدین کے درمیان سے افراد اٹھے اور انھوں نے اسلامی تحریک چلائی مگر خود شاہ صاحب اس میدان میں نہیں اترے۔ (اسلامی تحریک چلانے اور اسے منظم کرنے کی) یہ سعادت صرف مولانا مودودیؒ کے حصے میں آئی۔

آیندہ سطور میں بڑے اختصار کے ساتھ مولانا مودودیؒ کے تجدیدی کام کے صرف ایک پہلو کا ذکر کیا جائے گا۔ کلامی مسائل کی تقریر میں جو نیا اسلوب مولانا نے اختیار کیا ہے، اس کا مختصر تعارف چند مثالوں کے ساتھ پیش کیا جائے گا۔

مولانا مودودیؒ سے پہلے اسلامی عقائد کی تشریح اور دفاع کا کام ہندستان میں پہلے سے ہوتا رہا، جس میں ایک ممتاز نام، علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی (م ۱۰۶۶ھ /۱۶۵۶ء) کا ہے۔ مولانا مودودیؒ کے دور یا ان سے کچھ ہی پہلے علامہ شبلیؒ نعمانی کی "علم الکلام" اپنے موضوع پر ایک قابل قدر اور مفید تصنیف ہے۔ مگر اس میں علم کلام کے قدیم سرمایے ہی سے استفادہ کیا گیا ہے۔ کوئی نئی بات یا نیا اسلوب و استدلال یا نئی معلومات اس میں نہیں ملتیں۔ ڈاکٹر محمد اقبال کی کتاب: Reconstruction of Religious Thought in Islam تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ یقیناً مواد اور اسلوب دونوں کے اعتبار سے ایک نئی اور منفرد کوشش ہے۔ مگر ڈاکٹر صاحب کی اس فلسفیانہ کاوش سے کماحقہ استفادہ فلسفے کے طلبہ اور وسیع العلم حضرات ہی کر سکتے ہیں۔

مولانا مودودیؒ نے اسلامی عقائد اور بنیادی نظریات کی تشریح میں عام انسانوں کو پیش نظر رکھا ہے، ان کا انداز فلسفیانہ نہیں، کلامی ہے۔ مگر وہ کلامی مباحث میں ایک نئے اسلوب اور طریقے کے موجد ہیں، جو اس اسلوب سے بہت مختلف ہے جو کلام کی مشہور اور معروف کتابوں میں اختیار کیا گیا ہے۔ مولانا نے ۱۹۴۱ میں جماعت اسلامی کی تشکیل کے وقت امیر جماعت منتخب ہونے کے بعد خطبہ دیتے ہوئے کہا: "کلامی اور فقہی مسائل میں میرا اپنا ایک طریقہ ہے۔ جماعت اسلامی میری ان رایوں کی پابند نہیں ہے" (روداد جماعت اسلامی حصہ اول، ص ۳۴)۔ یہ بات کہ مولانا کا کلامی مسائل میں اپنا ایک طریقہ اور مسلک ہے، مولانا نے یوں ہی نہیں کہہ دی اور نہ مولانا اس طرح کی باتیں کرنے کے عادی تھے۔ مولانا کے کلامی اسلوب اور طریقہ استدلال کو کلامی فکر کی تاریخ کے پس منظر میں رکھ کر دیکھا جائے تو مولانا اپنے اس قول میں حق بجانب نظر آتے ہیں۔

مولانا کی کوئی مستقل تصنیف کلام میں نہیں ہے لیکن انھوں نے مختلف کلامی مسائل پر قلم اٹھایا ہے، مقالے اور رسالے لکھے ہیں۔ بعض کتابوں میں کلامی موضوعات پر ان کے مباحث کئی صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ خدا کا وجود، اس کی ذات و صفات، توحید اور شرک، وحی و نبوت، اور نبوت محمدی علیہ الصلوٰۃ والسلام، ختم نبوت، جبر و قدر، عدل و جور، حسن و قبح، زندگی اور موت، وسیلہ اور توسل وغیرہ مختلف مسائل پر مولانا

نے لکھا ہے۔ اس مختصر سے مقالے میں مولانا کے تمام کلامی آرا سے تعرض کیا' ان کا ذکر بھی آسان نہیں ہے۔ کوشش صرف اس بات کی ہو گی کہ چند بنیادی امور میں مولانا نے جو طریقہ استدلال اختیار کیا ہے اس کو واضح کر کے اس کی اہمیت اجاگر کر دی جائے۔

علم کلام کی پرانی معروف کتابیں جس علمی اور سماجی پس منظر میں لکھی گئیں' اس سے وہ پس منظر بہت مختلف ہے جس میں مولانا مودودیؒ نے کلام کیا ہے۔ پرانا علم کلام اس مفروضے پر قائم ہے کہ ماورائی حقیقتوں کے بارے میں بھی عقل کی بنیاد پر کسی حتمی رائے پر پہنچا جا سکتا ہے۔ چنانچہ علم کلام کی امہات کتب کی ابتدا میں علم کی بحث پڑھ کر یہ احساس ابھرتا ہے کہ مصنف کے نزدیک' خدا' کائنات' انسان' وحی و نبوت' زندگی بعد موت وغیرہ کے حقائق کے بارے میں عقل کی بنیاد پر قطعی دلائل دیے جا سکتے ہیں۔ امام غزالی نے "تہافتہ الفلاسفہ" میں مابعد الطبیعیاتی امور اور بعض طبیعاتی امور میں فلاسفہ کے نظریات پر تفصیل سے تنقید کی ہے' جن امور میں ان کے نظریات اسلامی عقائد سے مختلف ہیں' مثلاً عالم کے قدیم اور ابدی ہونے کا نظریہ تو ان نظریات کی تردید کی ہے اور جن امور میں اسلامی تصورات سے ان کا اتفاق ہے' امام نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ فلاسفہ ان کا اثبات کرنے سے عاجز ہیں۔ امام کی اس کتاب کا ایک اہم نتیجہ یہ تھا کہ مابعد الطبیعیاتی امور میں خالص عقلی بنیادوں پر کوئی قطعی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ انسانی عقل ان مسائل میں امکان اور اغلبیت کے اثبات سے آگے نہیں جا سکتی اور یقین عطا نہیں کر سکتی۔ یہ بات امام نے اپنی کتاب "المنقذ من الضلال" میں صاف طور پر کہی ہے۔ لیکن لگتا ہے کہ امام نے خود اس بات کو سنجیدگی سے نہیں لیا۔ ان کی "الاقتصاد فی الاعتقاد" اور دوسری تصنیفات کو پڑھ کر یہ تاثر نہیں ہوتا کہ ان کا مصنف "تہافت" اور "المنقذ" کا لکھنے والا ہے۔ امام موصوف کے بعد لکھی جانے والی کلام کی ممتاز اور مشہور کتابوں میں بھی اس خیال کا کوئی اثر نہیں ملتا۔

مولانا مودودیؒ کا کلامی فکر جس دور میں پروان چڑھا ہے اس میں ایک بنیادی تبدیلی آ گئی تھی۔ جرمن فلسفی' کانٹ (م: ۱۸۰۴ء) کی تصانیف بالخصوص (Critique of Pure Reason)' "عقل محض کی تنقید" کے بعد سے مغربی فلسفے میں یہ نظریہ عام ہو گیا کہ مابعد الطبیعیاتی امور میں صرف عقل کی بنیاد پر کوئی قطعی رائے قائم نہیں کی جا سکتی' اور کوئی مضبوط عمارت کھڑی نہیں کی جا سکتی۔ فلسفے کی دنیا میں ایک اور بڑی تبدیلی امریکہ کے ان فلسفیوں کے ذریعے آئی جنھوں نے Pragmatism کا نظریہ پیش کیا' جس کی رو سے نظریات کے قبول و رد میں یہ بات سب سے زیادہ اہم ہے کہ ان سے کون سے عملی مسائل حل ہوتے ہیں اور ان کے اثرات زندگی پر کیسے مرتب ہوتے ہیں۔

مولانا کے کلامی تفکر میں ان دونوں تبدیلیوں کا اثر ہے۔ پہلی کے زیر اثر مولانا یہ موقف اختیار نہیں

کرتے، جیسا کہ قدیم متکلمین کرتے ہیں، کہ وہ مابعد الطبیعیاتی امور میں حتمی اور قطعی دلائل مہیا کر سکیں گے اور بڑی صفائی سے کہتے ہیں کہ ان معاملات میں ایمان ہی ہوتا ہے، علم قطعی نہیں۔ لگتا ہے کہ مولانا کو اس بات پر یقین قرآن مجید کے مطالعے سے حاصل ہوا۔ جس کے شروع ہی میں کہا گیا ہے: "یہ کتاب ان پرہیزگار لوگوں کے لیے ہدایت ہے جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں" (البقرہ ۲:۲)۔

مولانا مابعد الطبیعیاتی امور میں اپنے قاری کو علم قطعی تک پہنچانے کا دعویٰ نہیں کرتے۔ وہ صرف یہ کہتے ہیں کہ ان امور میں انسان کے سامنے جو متبادل نظریات رکھے گئے ہیں یا پیش کیے جا سکتے ہیں ان میں اسلام کا نظریہ سب سے زیادہ معقول ہے۔ اس کے خلاف کوئی عقلی دلیل نہیں، اس کے مقدمات عقلی اصولوں کے مطابق ہیں، فطرت انسانی کے تقاضوں اور داعیات سے موافقت رکھتے ہیں اور ان کی بنیاد پر جو عملی رویہ مرتب ہوتا ہے، جس طرح کی زندگی تشکیل پاتی ہے اور جو سماج بنتا ہے، وہ اس عملی رویے، زندگی اور سماج سے بدرجہا بہتر ہے جو دوسرے نظریات کی بنیاد پر تعمیر پاتے ہیں۔ مولانا کی تقریر کا حاصل یہ ہے کہ اگرچہ ان امور میں "ایمان" (faith) سے مفر نہیں لیکن یہ ایمان عقل کے خلاف نہیں بلکہ عقل اور فطرت انسانی کے عین تقاضوں کے مطابق ہے۔ دوسرے الفاظ میں ایمان دو طرح کا ہو سکتا ہے: ایک عقلی (rational) اور دوسرا جس میں عقل کے خلاف مختلف چیزیں ہوتی ہیں اور جو مختلف درجے میں غیر معقول (irrational) ہوتا ہے۔ ان امور میں جس چیز کی طلب انسان کو کرنی چاہیے وہ علم قطعی نہیں، معقول ایمان (rational faith) ہے جو حیات بخش اور زندگی ساز ہو۔

مولانا نے یہ بات بڑی شد و مد سے رکھی ہے کہ عقلیت کے جو دعوے دار صرف علم چاہتے ہیں اور ایمان کی تحقیر کرنا چاہتے ہیں، انھیں یہ احساس نہیں ہے کہ انسانی زندگی، فرد کی ہو یا معاشرے کی، اس میں علم کا کم اور ایمان کا دخل زیادہ ہے۔ ہم کن ماں باپ کی اولاد ہیں، ہمارے آباو اجداد کون تھے، ہماری تاریخ اور روایات کیا ہیں، ہماری قومی زندگی کس طرح تشکیل پاتی ہے اور ان کی بنیادیں کن چیزوں پر استوار ہوئی ہیں، ان کا کتنا حصہ علم قطعی پر مبنی ہے اور کتنا ایمان پر؟ اسی طرح ہماری روز مرہ کی زندگی جس طرح کی معلومات پر قائم ہے، جس طرح کی خبریں، اخبارات، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور دوسرے ذرائع ابلاغ سے ملتی ہیں اور ہماری زندگی کو ڈھالتی رہتی ہیں، ان میں کتنا حصہ ایسا ہے جسے علم کہا جائے گا اور کتنا حصہ ایسا ہے جس کو ایمان اور اعتقاد کہا جائے گا؟ مولانا کہتے ہیں کہ اگر آپ بنظر غائر اس مسئلے کی تحقیق کریں تو آپ کو پتا چلے گا کہ ہماری زندگی میں علم کا دخل کم اور ایمان کا دخل کہیں زیادہ ہے۔

خدا کے وجود کے بارے میں متکلمین نے جو دلیل عام طور پر دی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ دنیا میں جتنی چیزیں ہیں وہ مختلف اجزا سے مرکب ہیں، ان اجزا میں ترکیب خود ان اشیا کے اجزا کے اندر سے نہیں آ

سکتی، اس لیے لازم ہے کہ خارج سے آئے اور وہ ذریعہ صرف خدا کی ذات ہے۔ یہ دلیل بڑے شرح و بسط اور منطقی ترتیب کے ساتھ امام الحرمین کی "کتاب الارشاد"، شہرستانی کی "نہایتہ الاقدام"، عبدالقاہر کی اصول الدین، امام رازی کی "اربعین" اور ایجی کی "المواقف" میں بیان ہوئی ہے۔ اگرچہ ان کتابوں میں اور دوسرے دلائل بھی دیے گئے ہیں جو جوہر اور عرض، امکان و حدوث وغیرہ تصورات سے شروع ہوتے ہیں۔

قرآن مجید نے خدا کے وجود کے سلسلے میں جو دلیل دی ہے متکلمین کی دلیل ترکیب اس کا ایک جز ہے۔ اس دلیل سے صرف ایک مرکب یا ترکیب دینے والے کا وجود ثابت ہوتا ہے مگر قرآن مجید کی دلیل صرف اشیا کی اندرونی ترکیب اور ساخت کے پیش نظر نہیں ہے بلکہ ان کے عمل و حرکت، ان کی غایت و مقصد، اور دوسری اشیا کے ساتھ ان کے تعلق و تعامل، تاثیر اور تاثر، سب کو پیش نظر رکھتی ہے۔ قرآن کی دلیل سے صرف ایک مرکب ہی نہیں خالق کا وجود ثابت ہوتا ہے۔

امام ابن تیمیہؒ نے دلیل ترکیب پر مفصل تبصرہ کیا ہے اور قرآن مجید کی دلیل خلق کو بڑی وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اسی طرح مولانا مودودیؒ نے بھی قرآن مجید کی دلیل کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اپنے مضمون "عقل کا فیصلہ" میں انھوں نے ایک اور طریقہ اختیار کیا ہے۔ یہاں انھوں نے کائنات کے وجود کے بارے میں مختلف نظریات گنائے ہیں، مثلاً یہ کہ کائنات خود سے وجود میں آگئی، یا جن مادوں سے اس کی مختلف چیزیں بنیں، ان میں ترکیب انھی کے اندر سے پیدا ہو گئی، یا یہ کہ اس کے مختلف اجزا کو مختلف روحوں اور دیوتاؤں نے وجود بخشا، ان مختلف نظریات کے قائلین کے بالمقابل کچھ افراد ابتدائے آفرینش سے ایسے بھی پیدا ہوتے رہے ہیں جنھوں نے یہ دعویٰ کیا کہ ان کے پاس علم کا ایک ذریعہ ہے جو دوسروں کے پاس نہیں، ان بزرگوں نے خواہ وہ کسی قوم میں اور کسی زمانے میں پیدا ہوئے ہوں، ایک ہی دعویٰ کیا کہ وہ اور خود یہ پوری کائنات ایک ہی خالق کی پیدا کردہ ہیں۔ وہی اس کا مدبر اور مالک ہے اور اسی کا قانون اس کائنات میں چل رہا ہے۔ پھر یہ لوگ نہ دیوانے تھے اور نہ کم عقل، نہ جھوٹے اور نہ دھوکے باز، برعکس اس کے وہ عقل و فکر، عزم و ارادہ، سیرت و اخلاق سب پہلوؤں سے اپنے زمانے کے تمام دوسرے افراد سے فائق و ممتاز تھے۔ مولانا نے ان انبیا کے نظریے کو دوسرے تمام نظریات کے مقابلے میں رکھ کر اس کی برتری ثابت کی ہے، اور اس طرح خدا کے وجود اور اس کی توحید کا اثبات کیا ہے۔

عام طور پر کلام کی کتابوں میں رسالت کی جو بحث ہوتی ہے اس میں وحی و نبوت کی ضرورت و بحث یا تو نہیں ہوتی یا بہت مختصر ہوتی ہے اور نبی و رسول کی پہچان پر تفصیل سے کلام ہوتا ہے۔ لیکن یہ کلام بعض وجوہ سے معجزے کے گرد گھومتا رہتا ہے جس کے ضمن میں معجزہ اور کرامت کے فرق، یا معجزہ اور سحر کے فرق کی بحث آتی ہے۔ نبی کی شناخت کو اس کے معجزات کے ساتھ وابستہ کرنے کی وجہ غالباً یہ رہی ہے کہ

کلام کی اکثر معروف و مشہور شخصیتیں اشعری فکر کی حامل رہی ہیں جن کے نزدیک حسن و قبح' خیر و شر میں امتیاز کے لیے عقلی بنیادیں نہیں ہوتیں۔ اس لیے نبی کی پہچان میں بھی عقل کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے ان بزرگوں کے لیے اس کی پہچان کی ایک ہی صورت باقی رہ جاتی ہے یعنی معجزہ۔

مولانا مودودیؒ تحسین و تقبیح کے معاملے میں اشعری نہیں ہیں' مولانا سے پہلے ابن تیمیہؒ بھی اس معاملے میں اشاعرہ سے اختلاف رکھتے تھے' اس لیے انھوں نے اور مولانا دونوں نے نبی کی صداقت جاننے کے لیے نبی کی تعلیمات کی معقولیت' اس کی سیرت و اخلاق کی بلندی' اس کی سچائی اور صداقت' اس کی بے لوثی اور قربانی' اس کی تعلیمات کی حیات ساز قوت اور قوموں کی زندگی کی تعمیر میں ان کے کردار اور کارناموں کو نمایاں کیا ہے۔ مولانا کا مقالہ' نبوت محمدی کا عقلی ثبوت اس طریقہ استدلال کی ایک نمایاں مثال ہے۔

مولانا کے اسلوب کی سب سے درخشاں مثال ان کا منفرد رسالہ "زندگی بعد موت" ہے۔ مولانا کے استدلال کا خلاصہ یوں بیان کیا جا سکتا ہے:

موت کے بعد کوئی زندگی ہو گی یا نہیں اور اگر ہو گی تو کیسی ہو گی' اس سوال کا جواب سائنسی ذرائع سے کام لے کر نہیں دیا جا سکتا' سائنس کی بنیاد پر اس زندگی کا اثبات کیا جا سکتا ہے اور نہ انکار۔ لیکن یہ سوال صرف ایک علمی سوال نہیں جس کا زندگی سے کوئی تعلق نہ ہو۔ اس لیے اس کے بارے میں سکوت اور غیر جانب داری کا رویہ اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ ایسے امور میں سکوت کے معنی بھی انکار ہی کے ہوں گے۔ اس لیے ہر انسان کو موت کے بعد کی زندگی کے بارے میں کوئی نہ کوئی فیصلہ لازماً کرنا ہو گا۔

موت کے بعد کی زندگی کی ضرورت کا احساس تھوڑے سے غور و فکر سے ہو جاتا ہے۔ اس دنیا میں ہم جو کام کرتے ہیں اس کے کچھ طبعی نتائج ہوتے ہیں اور کچھ اخلاقی۔ طبعی نتائج کے وقوع میں دیر نہیں لگتی مگر اخلاقی نتائج کا وقوع لازمی اور یقینی نہیں ہوتا۔ آپ اگر کسی بے گناہ شخص پر گولی چلائیں گے تو اس کی موت واقع ہو جائے گی' لیکن اس جرم کا اخلاقی نتیجہ یعنی یہ کہ آپ کو سزا ملے اس بات پر منحصر ہے کہ آپ کے خلاف مقدمہ ہو' عدالت میں آپ کا جرم ثابت ہو اور آپ کو سزا دی جائے۔ پھر اگر سزا بھی آپ کو ہو جائے تو یہ ضروری نہیں کہ وہ اس جرم کے متوازی ہو جو آپ نے کیا اور اکثر یہی ہوتا ہے کہ جرم کی یا تو کوئی سزا نہیں ہوتی یا اس کے برابر نہیں ہوتی۔ ایک آدمی پورے کنبے کو ہلاک کر دیتا ہے' اگر اس کو موت کی سزا بھی دی جائے تو وہ بھی تمام کنبے کے ہلاک کرنے کے جرم کے برابر نہیں ہو گی۔ اس کے برعکس بہت سے نیک افراد نیکی کرتے کرتے دم توڑ دیتے ہیں اور انھیں اس کا کچھ بھی صلہ نہیں ملتا۔

اگر غور کیا جائے تو پتا چلے گا کہ یہ دنیا اخلاقی جزا و سزا کے لیے بنائی ہی نہیں گئی۔ اس کا نظام اور انسانی زندگی کی موجودہ ہیئت ایسی نہیں کہ انسان اپنے نیک کاموں کا پورا اجر پا سکے یا اپنے مظالم کی پوری سزا بھگت

سکے۔

اگر عقل کا تقاضا، انسان کی فطرت کی پکار اور انسانی سماج کی بنیاد اس اصول پر قائم ہے کہ انسانوں کو اپنی بھلائی کی جزا پوری پوری ملے اور اپنی برائیوں کی سزا بھی پوری بھگتنی پڑے تو پھر ضروری ہے کہ موت کے بعد ایک ایسی زندگی ہو جہاں دنیا کا یہ نظام نہیں دوسرا نظام ہو جہاں انسان کی زندگی کی ساخت ایسی تبدیل کر دی جائے کہ مکافات کا عمل مکمل ہو سکے۔

مولانا نے لکھا ہے کہ یہاں تک عقل انسان کو پہنچا دیتی ہے۔ وہ یہ بتا دیتی ہے کہ موت کے بعد ایک زندگی آنی چاہیے تاکہ اس میں انسان کے اعمال کی جزا و سزا پوری طرح مرتب ہو سکے۔ لیکن کیا ایسا ہی واقعتاً ہے۔ یہ بات ہمیں انبیا کے بیان سے معلوم ہوتی ہے جو کہتے ہیں کہ آخرت کا وقوع اور اس کی جزا سزا ہمارے لیے صرف ایک امکان اور ایک ضرورت ہی نہیں ہے، ہمیں تو اس حقیقت کا مشاہدہ بھی کرا دیا گیا ہے، ہم اپنے علم و مشاہدے کی بنیاد پر کہتے ہیں کہ آخرت ہے اور اس زندگی میں ہمارے اعمال ہمارے سامنے پیش کیے جائیں گے اور ان پر ہمارا خالق اور مالک ہمیں پوری پوری جزا اور سزا دے گا۔

یہ استدلال ان دلائل کا نچوڑ ہے جو قرآن مجید نے آخرت کی ضرورت کے بارے میں دیے ہیں۔ اس کی ترتیب میں عقل کے حدود اور تقاضوں کو وہ مقام دیا گیا ہے جو ان کا ہے اور ایمان کو بھی وہ جگہ دی گئی ہے جو اسے حاصل ہے۔

(یہ مقالہ انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح بلریا گنج، اعظم گڑھ یوپی کے زیر اہتمام ۲۶ر اکتوبر ۹۶ کو منعقد ہونے والے ایک سیمینار کے لیے لکھا گیا)

تزکیہ و تربیت

نصائح اور مشورے

مولانا عبدالماجد دریا بادیؒ

صدق جدید میں وقتاً فوقتاً لوگوں کے استفسار اور خطوط کے جواب میں بڑے مفید نصائح اور مشورے مولانا دریا بادی مرحوم و مغفور کے قلم سے شائع ہوتے رہے جن کا ایک مفید انتخاب "مشورے اور گزارشیں" یا "کارآمد نصیحتیں" کے نام سے حال ہی میں کتابی شکل میں بھارت سے شائع ہوا ہے۔ ان میں سے چند مشورے اور نصائح نئی ترتیب کے ساتھ ہدیہ قارئین ہیں۔ (مدیر)

تصوف اور شریعت

تصوف یا سلوک یا طریقت، شریعت سے مختلف کوئی چیز نہیں بلکہ اسی کی مکمل اور انتہائی ترقی یافتہ شکل کا نام ہے۔ شریعت کی تعمیل محض ضابطے سے بھی ہو جاتی ہے، مثلاً نماز اگر محض ارکان ظاہری اور فقہی شرائط کی پابندی سے پڑھ لی جائے تو بس ادا ہو جائے گی اور پڑھنے والا جنت کا مستحق ہو جائے گا لیکن اگر نماز میں پوری طرح جی لگنے لگے اور حضورِ قلب کی لذت حاصل ہونے لگے تو یہی نماز عارفوں کی نماز ہو جائے گی۔ یہی حال روزہ اور ساری عبادات اور سارے اخلاق و معاملات کا ہے۔

شریعت اگر محض عبادت اور تعمیل ہے تو طریقت، عبادت مع لذت و حلاوت اور تکمیل ہے۔ اکابر و ائمہ تصوف، مثلاً جنید بغدادیؒ، شیخ جیلانیؒ کی زندگیوں نے یہی نمونہ پیش کیا ہے۔ یہ قول اکبر الٰہ آبادی۔

عبادت سے عزت شریعت میں ہے
عبادت میں لذت طریقت میں ہے

اعتدال اور غلو فی الدین

قرآن مجید کی فہم و تعبیر میں اختلاف ہونا تو ناگزیر ہے۔ صحابیوں اور بڑے بڑے ممتاز صحابیوں تک کے درمیان اختلاف تھا۔ یہی حال اتباع سنت کا ہے۔ جس نے رسولؐ کو جس حالت میں دیکھا، اسی کو سنت سمجھ کر اس کی پیروی ضروری خیال کی۔ انھی دونوں بنیادوں پر مختلف مکاتب خیال شروع سے پیدا ہو گئے۔ ان

کے قائم رہنے میں مطلق مضائقہ نہیں۔ یہ انتظام تو امت کی عین سہولت کے لیے تھا کہ ہر ایک کو اپنے اپنے مذاق و فہم و استعداد کے مطابق ایک سند مل جائے۔

غضب یہ ہوا کہ ان اختلافات پر جمود و عصبیت کا اضافہ ہو گیا، اور انھیں عین دین سمجھا جانے لگا---

جزئیات عقائد و جزئیات اعمال کے اندر اختلاف کی بڑی گنجایشیں ہیں۔ بہ قول حضرت اکبر الٰہ آبادی۔

ہر شیخ یہ کہتا ہے عقائد ہیں تو یہ ہیں!
توحید یہ کہتی ہے زوائد ہیں تو یہ ہیں

اقرار توحید و رسالت کے بعد واقعی دوسری چیزیں "زوائد" ہی میں داخل ہیں۔ یہ زوائد بھی ناقابل اعتنا نہیں۔ بعض زوائد بھی یقیناً بہت بڑی اہمیت رکھتے ہیں اور پورے اہتمام و توجہ کے مستحق ہیں۔ لیکن بہرحال اصل نہیں ہیں، فروع ہیں، جزو نہیں ہیں، شاخیں ہیں۔ شاخوں کے کٹ جانے سے درخت میں جتنی بھی بدنمائی پیدا ہو جائے درخت بہرصورت اپنی جگہ قائم رہے گا۔ جب تک کہ جڑ ہی پر صدمہ نہ پہنچ جائے۔

بالکل یہی حال دین کا ہے۔ اصل اور فروع (بہ شمول اہم فروع) کے درمیان فرق مراتب رکھنا لازمی ہے۔

جزئیات دین کا بھی تحفظ اپنی جگہ ضروری ہے لیکن اس میں شدت و غلو ہرگز نہ پیدا ہونے پائے بلکہ اعتدال و توازن کے ساتھ شاخ کو اصل کے ماتحت ہی رکھا جائے۔ ورنہ نتیجہ یہ ہو گا کہ فرقہ بندی بدترین شکلوں کے ساتھ پھوٹ پڑے گی، اور امت بے شمار فرقوں میں بٹ جائے گی۔ جس میں ہر فرد کو اپنا مخصوص فرقہ، امت سے کہیں بڑھ کر اہم و عزیز نظر آنے لگے گا۔ اور اس کی ساری ہمت بجائے امت کے، اس فرقے کا بول بالا رکھنے میں صرف ہو جائے گی۔ اسی کا نام تعصب ہے۔ ضرورت اس فرقہ واری عصبیت و حمیت کو اسلامی عصبیت و حمیت کے ماتحت اور اس سے مغلوب رکھنے کی ہے۔

کیا دین بھی کوئی ایسی مہیب و دشوار چیز ہے جس سے وحشت اور دہشت کی جائے۔ یہ تو زندگی کو بس سہل، سادہ اور فطری طریقے پر گزارنے کا نام ہے اور کسی سلیم الفطرت کو بھی اس سے گھبرانے اور ہول کھانے کی کوئی وجہ ہی نہیں۔ الٹا عین التفات اور رغبت ہی اس طرف ہونی چاہیے۔

زندگی، نام نہ کسی دقیق و غامض فلسفے میں در آنے اور اس کے اسرار و رموز کے سلجھانے کا ہے اور نہ اپنے اوپر سارے مرغوبات و مالوفات کے حرام کر لینے کا بلکہ خالق و مخلوق دونوں کے صحیح تعلقات کو سمجھ جانے اور ان کے برتنے کا نام ہے اور اسلام وہی ہے جو زندگی کو یہ نظام عطا کرتا ہے۔ الدین یسر کا دعویٰ لوٹ بدل کر قرآن و سنت رسولؐ نے بار بار پیش کیا ہے۔

جبر و اختیار

ثواب و عذاب، نیکی و بدی، خیر و شر--- اس دنیا میں جو کچھ ہے سب کی بنیاد انسان کی قوت انتخاب و اختیار ہی پر ہے۔ اس بنیادی و مرکزی حقیقت کو ذہن میں اتار لیا جائے۔ اگر انسان میں یہ قوت موجود نہ ہو تو وہ مجبور ہے کہ فلاں متعین راستے ہی کو اختیار کرے اور اس صورت میں انسان اور ایک بے جان مشین بالکل برابر ہیں اور جب انسان سلب ارادے کے بعد، مشین کی طرح بے بس و مجبور ہو گیا تو اب اس کے لیے نیکی، بدی، ثواب و عذاب، خیر و شر کے کوئی معنی ہی نہیں رہتے، جیسے کوئی متقی کرسی اور صالح دیوار اور نیک میز کوئی معنی ہی نہیں رکھتی۔ جانوروں، چھوٹے بچوں، پاگلوں پر کوئی سوال و جواب اسی لیے تو نہیں کہ وہ ارادے سے معریٰ اور قوت انتخاب سے محروم ہیں۔

اب اگر اللہ ہر انسان کو ہدایت لازمی طور پر دے رہا ہے تو اس کے صاف معنی یہ ہوئے کہ بندے سے اس کا ارادہ و اختیار چھن گیا۔ وہ ہدایت کی متعین راہ کے لیے مجبور و مضطر بنا دیا گیا اور بدی کی صلاحیت ہی اس سے سلب کر لی گئی۔ اس صورت میں نیکی، نیکی باقی ہی کب رہی؟ وہ تو سانس لینے اور حرکت قلب کی طرح ایک اضطراری اور لازمی چیز، جزو زندگی بن گئی۔

پھر ذرا اس کو بھی ذہن کے سامنے لے آیئے کہ عملاً یہ صورت حال اس دنیا میں ممکن کیونکر ہے؟ جب کوئی ظالم و مظلوم سرے سے باقی ہی نہ رہا تو داد رسی کس کی؟ اور فیصلہ کس کے درمیان ہوا؟ عدالتیں چھوٹی بڑی کوئی بھی باقی رہ سکیں گی؟--- جب کوئی چور، ڈاکو، لٹیرا، قاتل، زناکار، جعل ساز وغیرہ پایا ہی نہ جائے گا تو گواہ، قاضی، پولیس، فوج میں سے کسی چیز کا بھی وجود رہ سکے گا؟ حاکم و محکوم، افسر و ماتحت کے سارے ہی امتیازات فنا ہو جائیں گے اور جیل اور شفاخانے کی طرح جنت و دوزخ سب کا وجود بے کار ہی ہو کر رہ جائے گا۔ پیمبروں کی بعثت، کتب آسمانی کا نزول، ان کی شرح و تفسیر، واعظوں کا وعظ، عالموں کی تبلیغ سب تحصیل لاحاصل کے درجے میں ہوں گی۔ اس لیے کہ ہر شخص لازمی طور پر ہدایت یاب ہی ہو گا۔ غرض لزوم ہدایت کے فرض بے کے بعد عقل انسانی میں ہرگز نہیں آتا کہ دنیا کا نقشہ کیا سے کیا ہو کر رہے گا۔

سارا دھوکا مشیت خداوندی اور حکم خداوندی کے درمیان فرق نہ کرنے اور دونوں کو ایک سمجھ لینے سے پیدا ہو گیا ہے۔ پہلی چیز مرادف ہے علم خداوندی اور اس کے مطابق نقشہ تکوینی کے، اور دوسری چیز مرادف ہے مرضیات الٰہی اور ہدایات تشریعی کے۔ دونوں چیزیں بالکل الگ الگ ہیں اور دونوں ایک دوسرے کے نہ معارض و منافی ہیں نہ ایک دوسرے کی شریک و معین، نہ باہم مل جل کر رہنے والی، نہ باہم لڑ بھڑ کے، بلکہ ایک دوسرے کے متوازی اپنے اپنے خطوط پر چلنے والی۔

اب یہاں پہنچ کر مثال کے لیے ایک طبیب حاذق کو سامنے لایئے۔ اس کا علم بھی کامل اور اس کے نسخے

بھی بے خطا۔ مریض سے وہ بار بار تاکید پرہیز و احتیاط کی کرتا ہے۔ لیکن چونکہ خوب واقف ہے کہ مریض ان ہدایتوں پر عمل نہیں کر رہا ہے اس لیے ہلاکت یقینی ہے اور اس انجام کی پیش گوئی بھی وہ جزم و یقین کے ساتھ کر دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس انجام میں طبیب کی مرضی یا خواہش کو مطلق دخل نہیں بلکہ یہ انجام تو عین اس کی مرضی کے خلاف اور اس کی عدول حکمی کا ثمرہ ہے۔

اللہ کا حکم اور اس کی رضا یہی ہے کہ ہر بندہ توحید و عمل صالح اختیار کرے۔ لیکن اپنے علم کامل سے وہ یہ بھی جانتا ہے کہ جو بندہ اپنی قوت ارادی و انتخاب کے غلط استعمال سے راہ شرک و معصیت پر چلے گا اس کا انجام جنہم ہی ہے۔ یہ نتیجہ اللہ کی مرضی اور تعمیل احکام کے عین خلاف اور اس کے قانون تکوینی و مشیتی کے ماتحت ہو گا۔

خدا اور رسول کی رحمت

ایک صاحب نے سوال کیا: "بہت دنوں سے میرے خیال میں یہ شبہ ہو رہا ہے کہ رسول اللہؐ تو پوری دنیا کے لیے رحمت بن کر آئے تھے، تو پھر کفار کے خلاف تلوار کیوں اٹھائی۔ بہت سے لوگوں سے پوچھا، مگر کوئی مطمئن نہ کر سکا" --- تعجب ہے کہ اس سے پہلے اور بہت پہلے آپ کے ذہن میں یہ سوال کیوں نہ آیا کہ اللہ میاں تو رحمن و رحیم ہیں بلکہ اپنے کو ارحم الراحمین کہلاتے ہیں مگر پھر یہ کیا ہے کہ دنیا میں ہر طرف کشت و خون، لوٹ مار، ظلم و تعدی جاری ہے! درندوں اور جنگلی، وحشی جانوروں کو چھوڑیے خود عالم انسانیت میں کس قیامت کی سفاکی و شقاوت آج سے نہیں اول روز سے برپا ہے۔ کتنے خون ناحق ہر روز ہوتے ہیں۔ کتنے مظلوم ہروقت چیختے چلاتے رہتے ہیں۔ کتنی سہاگنیں ہر روز بیوہ اور کتنے بچے ہروقت یتیم ہوتے رہتے ہیں۔ یہ سب آخر کیا ہے اور اس عالمی خلفشار و رستخیز کو رحمت کامل سے کیونکر تطبیق دی جائے۔ ہے یہ کہ ہم مشاہدہ انسانی کی کمی اور انتہائی محدودیت کے باعث رحمت کامل کا مفہوم سرے سے غلط سمجھتے ہیں۔ اگر مشاہدہ کامل ہوتا اور نگاہ اس درجہ محدود نہ ہوتی تو اس لامحدود و مسلسل کائنات کے ایک ایک جزیہ کو نظر کے سامنے لے آتے اور ہر کڑی کا ربط واضح طور پر دوسری کڑی سے دیکھ لیتے اور اس وقت کوئی چیز بھی ناگوار اور خلاف رحم دکھائی نہ دیتی۔

رسولؐ کی رحمت بھی خدا کی رحمت سے الگ نہیں۔ رحمۃ اللعالمینؐ کے معنی ہی صرف یہ ہیں کہ ہر موقع رحم پر آپ کا برتاؤ رحم ہی کا رہا، اور ہر دو عالم کے لیے آپ کا وجود باعث برکت و موجب رحمت اور وجہ فضل رہا اور سارے عالم کو فلاح و بہبود و ہدایت کا راستہ آپؐ ہی کی ذات سے ملا--- یہ مراد نہیں کہ آپؐ نے موقع بے موقع کا کوئی لحاظ ہی نہ رکھا اور اندھا دھند شیر اور بکری، سانپ اور چیونٹی اور سنکھیا اور شہد کے ساتھ ایک ہی معاملہ رکھا۔ ڈاکٹر نشتر بھی لگائے گا، ہاتھ پیر بھی کاٹے گا۔ طبیب مسہل بھی دے گا،

فاقہ بھی کرائے گا۔ کڑوی سے کڑوی دوا بھی پلائے گا۔ باپ لڑکے کی تادیب کے لیے سزا بھی دے گا اور یہ سب کچھ محبت، شفقت اور رحم ہی کے تحت ہو گا۔ ظلم و بے رحمی کا اطلاق ان میں سے کسی ایک موقع پر بھی نہ ہو گا۔

عام حالات اور ذاتی معاملات میں آپؐ کا برتاؤ انسان تو انسان جانوروں تک کے ساتھ شفقت و مہربانی کا رہا۔ آپؐ کی ہمدردی، نرم مزاجی، چشم پوشی، کریم النفسی دشمنوں تک کو مسلم تھی لیکن جب موقع سختی کا آ پڑا اور بجز کڑے آپریشن کے کوئی صورت مریض کے اور سارے عالم کی فلاح و بہبود کے لیے نہ رہ گئی تو حکم الہی سے آپؐ نے جہاد و قتال بھی کیا تاکہ دنیا کی راہ سے فساد دور ہو اور امن کی راہ کل عالم کے لیے کھل جائے۔ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ (البقرہ ۲: ۱۹۳)، "تم ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لیے ہو جائے"۔

اسلامی لٹریچر

سوال: جماعت اسلامی کے زیر اثر اسلامی ادب کے کام کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: بہت ہی اچھا خیال ہے۔ جماعت اسلامی ہند کے کاموں میں یہی تو ایسا ہے جس سے سو فی صدی اتفاق ہے--- اس خدمت سے بڑھ کر تو اور کوئی بھی دینی خدمت اس وقت نہیں کہ دنیا کے علوم و فنون کو مسلمان اور باخدا کیا جائے۔

عصر حاضر کے سارے فتنوں کا سرچشمہ تو یہی دنیا کے علم و فن کی خدا بیگانگی اور مذہب ناآشنائی ہے اور جس نے یہ کر لیا کہ جغرافیہ کو مسلمان کر لیا، تاریخ کو مسلمان کر لیا، ادب کو مسلمان کر لیا، سائنس کو مسلمان کر لیا، ریاضی کو مسلمان کر لیا، طب کو مسلمان کر لیا، اس نے ساری دنیا سے اسلام کا کلمہ پڑھوا لیا۔ گو ظاہر ہے کہ کام ہے اتنا عظیم الشان کہ ایک فرد کا کیا ذکر ہے، سو دو سو بڑے بڑے عالم و فاضل مل کر بھی نہیں انجام دے سکتے ہیں۔ دنیا کی ہزارہا یونی ورسٹیوں اور اکیڈمیوں سے بیک وقت لڑنا ہو گا۔ کم سے کم یورپ کی ۴، ۵ مشہور ترین زبانوں میں۔

سوال: رمضان شریف میں، میں نے محفل ذکر میں "برکات رمضان" سے کچھ پڑھ کر سنایا تھا تو سب نے بہت پسند کیا۔ صرف ایک بات تھی کہ اس میں اردو ذرا مشکل ہے اور یہاں کی عورتوں کے معیار سے اونچی۔ اس کے لیے میں نے سوچا تھا کہ اس کو عام فہم اردو میں لکھ کر سب کو دے دوں۔ لیکن پھر مصروفیات کی بنا پر یہ نہ ہو سکا۔

جواب: رائے درست تھی لیکن اگر ممکن ہو تو "اونچے" طبقے میں تبلیغ کی ضرورت اس سے اشد ہے۔ اس بے حیائی، آوارگی، فحش پسندی، بے اعتقادی بلکہ نیم ارتداد کا جو فتنہ "بیگمات" تک پہنچ چکا ہے، وہ شدید ترین ہے اور فوری توجہ کا محتاج۔ اس طبقے تک پہنچنے کے لیے مولانا مودودیؒ کی تحریریں بہت بہتر ہوں گی۔

38

اپنے ایمان کو تر و تازہ رکھنے کے لیے

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

کا

خزینہ حکمت و معارف

تفہیم القرآن

مطالعہ میں رکھیے

یہ آج کی دنیا میں

☆ دین کے تقاضے پورے کرنے کا راستہ ہم کو دکھائے گی

☆ اس کے لیے کھڑا بھی کرے گی

☆ چلنے کے لیے عزم و حوصلہ بھی دے گی

۶ جلدیں ۴ ہزار سے زائد صفحات

ہدیہ: -/۱۵۰۰ روپے خصوصی سیٹ -/۲۵۰۰ روپے

کسی اہم بک اسٹال سے یا ہم سے حاصل کیجیے

ادارہ ترجمان القرآن، اردو بازار، لاہور - فون: 7234014

اسلام میں غیر جانب داری کا تصور

محمود احمد غازی

(دوسری اور آخری قسط)

مسلمان فقہا نے بین الاقوامی تعلقات کے جو تفصیلی احکام مرتب کیے اس کی رو سے انھوں نے پوری دنیا کو مسلمانوں سے اس کے تعلق اور اس کی نوعیت کے حوالے سے مختلف خطوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک تقسیم وہ ہے جو امام ابوحنیفہؒ نے کی جس میں انھوں نے پوری دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔ ایک دارالاسلام اور دوسرا دارالحرب۔ امام ابوحنیفہؒ کی تقسیم اس لحاظ سے ہے کہ دارالاسلام سے مراد وہ علاقہ ہے کہ جہاں مسلم اکثریت ہو' اس کو وہاں اقتدار حاصل ہو اور وہاں احکام اسلام نافذ ہوں اور جہاں ان سے ایک شرط مفقود ہو گی وہ دارالحرب ہو گا۔ اس تقسیم کے نتیجے میں مسلمانوں کے قرب و جوار میں جو ممالک تھے ان سب کو دارالحرب کہا گیا' اس لیے کہ ان میں سے قریب قریب سب سے عملاً جنگ جاری تھی (مثلاً رومی قریبی ہمسائے تھے اور ان سے جنگ جاری تھی۔ مصر کے قبطیوں سے جنگ جاری تھی۔ اسپین میں قشتالیوں سے جنگ جاری تھی)۔ اس لیے فقہاے اسلام میں سے بہت سے حضرات نے اصول یہ قرار دیا کہ مسلمان اور غیر مسلم کے درمیان تعلقات کے باب میں اصل جنگ ہے: الاصل فی علاقات المسلمین بالکفار الحرب۔ لیکن اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ چونکہ ان سے بالفعل حالت جنگ قائم ہے لہٰذا ان کی طرف سے کسی بھی وقت حملہ ہو سکتا ہے' ان سے غافل نہ رہنا چاہیے بلکہ ہر لمحے جنگ کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ اس کے مقابلے میں بعض فقہا نے یہ کہا کہ اصل یہ ہے کہ تعلقات پرامن ہوں اور حالت جنگ ایک عارضی کیفیت ہے۔ اول الذکر حضرات نے حکمت عملی کے پیش نظر اور مسلمانوں کو متحرک رکھنے کی نیت سے جب غور کیا تو محسوس کیا کہ جنگ مسلسل چلی آ رہی ہے۔ لہٰذا انھوں نے قرار دیا کہ حالت جنگ ہی مسلمانوں کے درمیان اصل ہے اور امن ایک عارضی کیفیت ہے۔ جیسا کہ وہ فی الواقع تھی بھی۔ ان حضرات نے جنگ کو اصل اس لیے قرار دیا کہ مسلمان تو بلاجواز جنگ کے قائل ہی نہیں ہیں' اور جنگ ہمیشہ غیر

مسلموں ہی کی طرف سے مسلط کی جاتی رہی ہے' اس لیے یہی اصل ہے۔ تاریخ سے بھی یہی پتا چلتا ہے کہ جب بھی مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان جنگ ہوئی' وہ غیر مسلموں کی آغاز کردہ اور ان کی مسلط کردہ تھی۔

یہ نقطہ نظر امام ابو حنیفہؒ اور ان کے ساتھیوں کا ہی نہیں ہے بلکہ بعض دوسرے مفکرین ان سے قبل بھی اس نقطہ نظر کے حامل رہے ہیں۔ یہ بات امام صاحب سے ایک ہزار سال قبل افلاطون نے بھی کہی ہے کہ تعلقات کی نوعیت متمدن اور غیر متمدن دنیا میں جنگ ہے' اور متمدن دنیا کا یہ فرض ہے کہ وہ غیر متمدن دنیا کے خلاف مسلسل مار دھاڑ اور جنگ و جدال جاری رکھے اور ان کو اپنی پیروی پر مجبور کرے۔ اسی طرح کے تصورات دیگر اقوام میں بھی موجود رہے ہیں۔ جن فقہاے کرام نے تعلقات میں اصل جنگ کو قرار دیا ہے' وہ اس کے تین تصورات بیان کرتے ہیں اور ان تینوں سے تین علیحدہ علیحدہ احکام نکلتے ہیں جن کی پیروی مسلم حکمرانوں کو کرنی چاہیے۔ اگر نظریہ یہ ہے کہ مسلمان دوسروں سے نظری طور پر برسرِجنگ رہے' چاہے وہ جنگ عملی طور پر پچاس سال تک نہ ہو' گویا ہنگامی حالت کا نفاذ برقرار رہے کہ کسی وقت بھی جنگ چھڑ سکتی ہے تو اس صورت میں مسلمان' دشمن کے مقابلے میں کوئی مستقل عدم جنگ کی پالیسی نہیں اپنا سکتے۔ دوسرا تقاضا یہ ہے کہ محض محتاط ہونا کافی نہیں بلکہ اس کے لیے تیاری کی ضرورت بھی ہے۔ اگر دشمن پرامن تعلقات کو اچانک ختم کر کے برسرپیکار ہو جائے اور یہ خطرہ ہمہ وقت موجود ہو تو اس کے لیے حکم ہے وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ' قرآن مجید کا یہ حکم اسی صورت حال کے لیے ہے۔ یہ حکم ہے ہی اس لیے کہ دشمن اسلام ہمیشہ مسلمانوں کے رعب و دبدبے کا شکار رہے۔ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ کہ تم اپنے اور اللہ کے دشمنوں کو اور جو آنے والے ہیں جن کو تم نہیں جانتے ان کو رعب و خوف (deterrence) کی کیفیت میں رکھو تاکہ تمھارا دشمن اسلام کے راستے میں رکاوٹ نہ بن سکے اور مسلمانوں پر جنگ مسلط نہ کر سکے۔ تیسری چیز یہ ہے کہ مسلمانوں کو متحرک اور سرگرم رکھنے کے لیے اور ایک عام مسلمان کے جذبہ جہاد و قتال کو زندہ رکھنے کے لیے کہ وہ نظری طور پر جنگ کے لیے تیار رہے' ایسا تصور ناگزیر ہے۔ اگر نظری طور پر ایسا کیا جاتا رہے تو مسلمانوں کو یہ بتایا جائے گا کہ انھوں نے بالآخر دشمن کے خلاف جنگ کرنا ہے۔ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے کہ جب تعلقات میں اصل جنگ ہو اور نووار پیکٹ (معاہدہ عدم جنگ) عارضی ہو۔ درمیان میں بظاہر امن کا وقفہ ہے' یہ کم بھی ہو سکتا ہے اور زیادہ بھی۔

یہ تقسیم تو وہ ہے جو امام ابو حنیفہؒ اور ان کے ساتھیوں کی' کی ہوئی ہے اور اس تصور کی بنیاد پر وہ دنیا کو دارالاسلام اور دارالحرب میں تقسیم کرتے ہیں۔ لہٰذا ہر وہ علاقہ جس سے مسلمانوں کے تعلقات پُرامن ہوں' وہاں اسلامی ریاست کی بالادستی کو تسلیم کیا جاتا ہو اور وہاں اسلامی ریاست کا سِکّہ چلتا ہو تو وہ امام ابو حنیفہؒ کی

تعریف کی رو سے دارالاسلام اور دوسرے ائمہ کی تعریف کی رو سے دارالصلح ہے۔ اگر وہاں اسلامی شریعت کو بالادستی حاصل نہیں یا اسلامی اسٹیٹ کی سیاسی برتری کو تسلیم نہیں کیا جاتا تو وہ دارالحرب ہے۔ اس لیے امام صاحب کے نزدیک دارالعہد یا دارالصلح کوئی منفرد یا مستقل علاقہ نہیں ہے بلکہ دارالاسلام یا دارالحرب ہی کا ایک حصہ ہے۔

اس کے مقابلے میں امام شافعیؒ اور کئی دیگر فقہا کا نقطہ نظر یہ ہے کہ پوری دنیا تین حصوں میں منقسم ہے: ۱۔ دارالاسلام، جہاں اسلام کی بالادستی ہو۔ ۲۔ دارالحرب یا دارالکفر جہاں مسلمانوں کا قانون نہ چلتا ہو اور وہاں غیر مسلموں کی بالادستی ہو اور وہاں اسلامی ریاست کی سیاسی برتری تسلیم نہ کی جاتی ہو۔ ۳۔ دارالعہد یا دارالصلح جہاں مسلمانوں کے ساتھ تعلقات خوشگوار اور پرامن ہوں اور جن سے مستقبل میں کسی قسم کی منافرت یا لڑائی کا امکان نہ ہو۔

اسی کے ساتھ ایک اور تقسیم بھی ہے جو تمام فقہا نے کی ہے۔ یہ دار الاسلام اور دارالعہد کے درمیان ایک قسم ہے جو دارالبغی کہلاتی ہے، یعنی وہ علاقہ جہاں مسلمانوں کے باغیوں کا قبضہ ہو جائے۔ فقہی اعتبار سے یہ ایک عارضی تقسیم ہے تاہم غیر جانب داری کے تعلقات ان سے بھی قائم ہو سکتے ہیں۔ ویسے دراصل باغیوں کا علاقہ بھی دارالاسلام ہی کہلائے گا کہ وہاں حکمرانی مسلمانوں کی ہی ہو گی اور وہاں نفاذ احکام اسلام کا ہی ہو گا، فرق صرف یہ ہے کہ یہ وہ علاقہ ہے جو باغیوں نے اپنے قبضے میں لے لیا ہے۔ پہلے عرض کیا گیا تھا کہ ایسے مسلمانوں کا گروہ جو شریعت کے کسی حکم کی تاویل کی بنا پر اسلامی ریاست سے علیحدہ ہو گیا ہو اور جس کے پاس اپنی ایک مستقل سیاسی اور عسکری قوت ہو اور وہ کسی علاقے پر قابض ہو کر اپنا الگ نظم قائم کرلیں، ایسے علاقے کو دارالبغی اور وہاں کے باشندوں کو اہل البغی کا نام دیا گیا ہے۔ ان لوگوں سے تعلقات کا ایک الگ قانون ہے جس کی تفصیلات فقہائے کرام نے حضرت علیؓ کے طرز عمل سے اخذ کی ہیں۔ دارالبغی میں بعض اوقات غیر جانب دار علاقے بھی بن سکتے ہیں اور ان سے مسلمانوں کا ایک عارضی پرامن بقائے باہمی کا معاہدہ بھی ہو سکتا ہے۔ ماضی میں ایسی مثالیں موجود ہیں۔ حضرت علیؓ کے دور خلافت میں خوارج کے ساتھ ان کے تعلقات اس معاملے میں بہت سے نظائر فراہم کرتے ہیں، اور دارالبغی اور دارالحرب کے فرق کو ان کے جداگانہ احکام کے لحاظ سے ممیز کرتے ہیں۔

دوسری طرف امام شافعیؒ جس علاقے کو دارالصلح کہتے ہیں، یہ وہ علاقہ ہے جس سے مسلمانوں کا کوئی پرامن بقائے باہمی کا معاہدہ ہوا ہو یا مسلمانوں کے ساتھ ان کے تعلقات پرامن ہوں، وہاں رہنے والے مسلمانوں کو اپنے دین پر عمل کرنے اور اس کی دعوت دینے کی کھلی آزادی ہو اور ان کے لوگوں کو عام مسلمانوں کے ساتھ میل جول کی عام اجازت ہو۔ اس سلسلے میں امام شافعیؒ اور ان کے رفقا عہد نبویؐ میں

نجران کے علاقے کی مثال بیان کرتے ہیں۔ نجران کا علاقہ عیسائی اکثریت کا علاقہ تھا۔ حضور علیہ السلام نے ان سے معاہدہ کیا اور اس معاہدے کے نتیجے میں مقامی طور پر انھیں خود مختاری دی گئی۔ ان کے تمام ادارے اسی طرح قائم رہے' ان کا مذہبی نظام اسی طرح موجود رہا۔ معاہدے میں واضح طور پر یہ لکھا گیا کہ ان کا مذہبی نظام علیٰ حالہ باقی رہے گا۔ اس کے مقابلے میں وہ اسلامی ریاست کی عمومی بالادستی قبول کر کے اس کو خراج ادا کریں گے۔ امام شافعیؒ اس علاقے کو دارالصلح کہتے ہیں اور اس کو دارالحرب سے ایک علیحدہ مستقل علاقہ قرار دیتے ہیں۔ اس کے برعکس امام ابوحنیفہؒ اسے دارالاسلام قرار دیتے ہیں۔ اس لیے کہ اس نے اسلامی ریاست کی بالادستی قبول کر لی ہے اور اسلامی ریاست کی شرائط تسلیم کر لی ہیں۔

اسی طرح سے حضور علیہ السلام جب مدینہ تشریف لائے اور مدینہ منورہ میں اسلامی ریاست کی تشکیل کا کام مکمل ہو گیا تو آپؐ نے آس پاس کے بعض قبائل سے معاہدے کیے جن میں بنو سلیم اور جہینہ نامی قبیلے نمایاں تھے۔ ان سے دوستی اور عدم جنگ کے معاہدے کیے۔ ایک قبیلہ جن سے جنگ بدر کے قریب معاہدہ کیا گیا اور جس میں طے کیا گیا کہ وہ مسلمانوں پر حملہ نہ کریں گے اور مسلمان ان پر حملہ نہ کریں گے۔ اگر اسلامی ریاست کسی بیرونی طاقت کے خلاف جنگ کرے گی تو یہ اس کی مدد کے پابند نہ ہوں گے۔ البتہ اگر کوئی غیر مسلم طاقت مدینہ منورہ پر حملہ آور ہو تو یہ اس صورت میں مدد دیں گے۔ یہ واقعتاً ایک بین الاقوامی نوعیت کا معاہدہ ہے جس میں ایک مسلم ریاست نے دوسری آزاد ریاست سے برابری کی سطح پر تعلقات قائم کیے ہیں۔ یہ انتظام ۲ ہجری سے کم از کم ۸ ہجری تک قائم رہا' تا آنکہ پورے قبیلے نے ۸ ہجری میں اپنی مرضی سے مدینہ منورہ آکر برضا و رغبت اسلام قبول کر لیا' اس لیے کہ رسول اللہؐ کا حکم تھا کہ جو اسلام قبول کرے وہ مدینہ آکر رہائش پذیر ہو جائے۔ اس طرح ان میں سے بہت سے لوگ وہاں رہائش پذیر ہو گئے لیکن اجتماعی طور پر اسلام قبول کرنے والے نو مسلموں کو مدینہ آنے کا پابند نہیں کیا گیا۔ یہ ۳ ہجری سے ۸ ہجری تک پانچ سال کا عرصہ ہے۔ امام شافعیؒ کی اصطلاح میں یہ دارالصلح ہے۔ یہی چیز بنو سلیم اور دیگر ایسے قبائل پر بھی منطبق ہوتی ہے۔ امام شافعیؒ نے اس ضمن میں مکہ مکرمہ کی مثال بھی دی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ صلح حدیبیہ سے فتح مکہ سے چند ماہ پہلے تک مکہ مکرمہ کو غیر جانب دار علاقہ تصور کیا جائے گا اس لیے کہ اس میں اہل مکہ سے تجارت ہوتی تھی' آمدورفت کی کلی آزادی تھی' پرامن تعلقات کے جملہ عوامل موجود تھے' تجارتی معاملات قائم تھے' آزادی سے لین دین ہو رہا تھا۔ اس طرح امام شافعیؒ کے نزدیک یہ ایک غیر جانب دار علاقہ یا دارالصلح تھا۔ اور جب تک کہ ابوسفیان اور دیگر سرداران مکہ نے اس معاہدے کی خلاف ورزی نہیں کی' یہ دارالصلح ہی شمار ہوتا رہا۔

تقریباً یہی کیفیت فدک کے معاملے کی ہے۔ فدک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک معاہدہ

فرمایا اور یہودیوں کے ساتھ بعض شرائط طے کیں۔ وہ اگرچہ اس برابری کی بنیاد پر تو نہ تھیں جس برابری کی بنیاد پر قریش مکہ سے شرائط طے کی گئی تھیں کیونکہ اس میں یہودیوں کی حیثیت بہت کمزور تھی اور مسلمانوں کی حیثیت کافی مضبوط تھی۔ لیکن اس علاقے کو مفتوحہ علاقہ قرار نہیں دیا گیا اور وہاں کی زمینوں کو اس طرح مکمل سرکاری ملکیت میں نہیں لیا گیا جس طرح دیگر مفتوحہ علاقے فتح کر لیے گئے۔ اس اعتبار سے فدک کو شبہ دارالصلح کہا جا سکتا ہے۔

لیکن دارالصلح اور غیر جانب دار علاقہ کی سب سے زیادہ نمایاں مثالیں جو ہو سکتی ہیں وہ دو ہیں: ایک حبشہ کا علاقہ، دوسرا ترکی کا۔ حبشہ سے مسلمانوں کے تعلقات ابتدا سے ہی قائم ہو گئے تھے اور اس کو حضورؐ نے بھی ارض عدل و قسط قرار دیا تھا۔ وہاں مسلمان گئے اور عرصہ دراز تک رہے۔ وہاں کی حکومت سے مدینہ کے تعلقات ہمیشہ خوشگوار رہے۔ حتیٰ کہ حضورؐ نے ہدایت فرمائی جب تک "حبشی" تم پر حملہ نہ کریں تم بھی ان پر حملہ نہ کرو۔ (دعوا الحبش ما ودعوکم)۔ ایک اور موقع پر فرمایا جب تک وہ تم کو چھوڑے رہیں تم بھی ان کو چھوڑے رہو (اترکوا الحبش ما ترکوکم)۔ اس ارشاد کی مسلمانوں نے ہمیشہ پیروی کی اور آج تک پیروی کر رہے ہیں۔ کوئی اسلامی سلطنت ایسی نہ تھی اور نہ ہے جس نے حبشہ پر حملہ کیا ہو۔ حبشہ میں مسلمانوں پر مظالم بھی ہوئے لیکن مسلمانوں نے کبھی اس پر حملہ نہ کیا۔ کم و بیش ایک ہزار سال تک حبشہ سے تعلقات نہایت اچھے رہے اور فریقین نے غیر جانب داری کا مکمل طور پر ثبوت فراہم کیا۔

یہی کیفیت اور یہی معاملہ نوبیا کا رہا ہے جو سوڈان کا ایک علاقہ ہے۔ یہ علاقہ عثمانی ترکوں کے دور میں اسلامی ریاست کا حصہ رہا۔ آج اس کا بڑا حصہ سوڈان میں شامل ہے اور غالباً یہی وہ علاقہ ہے جس سے حضرت بلالؓ کا تعلق تھا۔ حضرت عثمانؓ کے دور میں جب حضرت عبداللہ ابن سعدؓ بن ابی سرح مصر کے گورنر تھے تو ایک طویل جنگ جسے مورخین نے قتال کبیر کے نام سے یاد کیا ہے، مسلمانوں اور نوبیا کے درمیان ہوئی جس میں فریقین میں سے کسی کو بھی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ اس جنگ میں نوبیوں نے پیش کش کی کہ ہم بقائے باہمی کے اصول پر صلح کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اس پیش کش کے نتیجے میں عبداللہؓ ابن سعد ابن ابی سرح نے ان سے معاہدہ کر لیا۔ معاہدہ یہ تھا کہ نوبی سالانہ خراج ادا کریں گے جن میں کچھ جانور بھی ہوں گے، اس کے مقابل مسلمان ان کو خوراک فراہم کریں گے۔ فریقین کے مابین آپس میں سلسلہ آمدورفت بھی رہے گا۔ آپس میں جنگ نہ ہو گی، اگر مسلمانوں کی کسی سے جنگ ہو گی تو نوبیا کے لوگ کسی فریق کا ساتھ نہ دیں گے اور اگر نوبیا کسی سے برسرپیکار رہا تو مسلمان بھی فریقین میں سے کسی کا ساتھ نہ دیں گے۔ یہ معاہدہ خلیفہ ثالث حضرت عثمان غنیؓ کو بھیجا گیا۔ آپؓ نے دیگر صحابہؓ کے مشورے سے اس کو قبول کیا۔ حضرت عثمان غنیؓ کے دور میں ہونے والے اس معاہدے پر چھ سو سال تک عمل ہوتا رہا اور اس طویل عرصے میں

کسی فریق نے اس معاہدے کی خلاف ورزی نہ کی۔ بنو امیہ اور بنو عباس کا دور گزر گیا، جب مصر پر فاطمیوں کا قبضہ ہوا تو انھوں نے اپنے آخری دور میں اس معاہدے کی خلاف ورزی کی۔ پھر ممالیک کا دور شروع ہوا تو اس وقت اس معاہدے کی پابندی نہ کی جا سکی۔ اس کے کیا اسباب تھے یہ ایک علیحدہ اور طویل بحث ہے جو اس گفتگو کے دائرے سے خارج ہے۔ قصہ کوتاہ یہ کہ مسلمانوں نے اسے فتح کر لیا۔ اس سلسلے میں کہا جاتا ہے کہ وہاں کے اکثر لوگ مسلمان ہو گئے تھے، کچھ کا خیال ہے کہ وہاں مسلم اقلیت پر مظالم ہو رہے تھے، کچھ کہتے ہیں کہ اس جنگ کی ابتدا چند تخریب کار لوگوں نے کی۔ بہرحال یہ چھ سو سال کا طویل عرصہ اس بات کی دلیل ہے کہ مسلمانوں کے پرامن بقائے باہمی کے تعلقات نوبیہ، حبشہ اور ترکی وغیرہ کے غیر مسلموں سے رہے ہیں اور انھوں نے صدیوں تک اپنے معاہدوں کی پاسداری کی ہے۔ حبشہ، نوبیا، نجران وغیرہ اس سلسلے کی مثالیں ہیں۔

اس سلسلے کی ایک اور اہم مثال آرمینیا کی ہے۔ وہاں حضرت عثمانؓ کے دور میں مسلمان پہنچ گئے تھے اور ایک سال تک وہاں قتال جاری رہا۔ قتال کا کوئی حتمی نتیجہ نہ نکلنے کی وجہ سے فریقین کا باہمی معاہدہ ہو گیا جس کے نتیجے میں صلح ہو گئی۔ مسلمانوں نے صدیوں اس معاہدے کا احترام کیا اور سات سو سال کے لگ بھگ ان سے صلح کے تعلقات قائم رہے۔ پھر جب ترکوں کا عروج شروع ہوا اور مسلمانوں کو اس علاقے میں بالادستی حاصل ہو گئی تو انھوں نے اس معاہدے کی پابندی نہیں کی۔ یہ وہ بڑی مثالیں ہیں جو اسلام کے غیر جانب داری کے تصور کو واضح کرتی ہیں۔

حضرت امام رازیؒ نے مذکورہ آیت کریمہ (یعنی فَاِنِ اعْتَزَلُوْکُمْ) کی تفسیر میں ایک معاہدے کا ذکر کیا ہے جو حضورؐ اور قبیلہ بنو سلیم کے درمیان ہوا تھا جس کے مطابق یہ طے ہوا کہ فریقین میں کوئی ایک فریق دوسرے فریق سے متحارب کسی قوم یا گروہ کی مدد نہ کرے گا۔ اور دونوں فریقوں میں سے اگر کسی فریق کا کوئی فرد دوسرے فریق کا انفرادی طور پر ساتھ دینا چاہے تو دے سکے گا۔ اسی طرح اگر کوئی دوسرا فریق ان میں سے کسی ایک فریق کے ساتھ معاہدہ کرنا چاہے گا تو وہ کر سکے گا جس پر دوسرے معاہد کو اعتراض نہ ہو گا۔ اس طرح کی ایک مثال صلح حدیبیہ میں بھی ہے کہ بعد از صلح ایک قبیلے نے کفار مکہ کا ساتھ دینا چاہا جس پر مسلمانوں نے کوئی اعتراض نہ کیا اور ایک قبیلے نے مسلمانوں کا ساتھ دینے کا اعلان کیا جس پر کفار مکہ نے اعتراض نہ کیا۔ ان دونوں معاہدوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ کسی دو فریقی معاہدے میں اگر کوئی تیسرا فریق، گروہ یا قوم فریق بننا چاہے تو دونوں معاہد فریقوں کی رضامندی سے شریک ہو سکتا ہے، جیسا کہ یہ دونوں معاہدہ حدیبیہ میں شامل ہوئے۔

اس علاقے کو جہاں اس قسم کا معاہدہ ہوا ہو، امام شافعیؒ اور دوسرے فقہاے اسلام دار الصلح کہتے ہیں۔

فقہاے احناف اسے دارالموادعہ قرار دیتے ہیں۔ دارالموادعہ احناف کے ہاں دارالحرب ہی کی ایک قسم ہے۔ اس لیے کہ وہ موادعہ' ایک قسم کی عارضی جنگ بندی کو کہتے ہیں۔ امام سرخسیؒ شرح السیر الکبیر میں لکھتے ہیں: ان دار الموادعہ دار حرب' لا یجری فیہا حکم المسلمین۔ یعنی دارالموادعہ دراصل دارالحرب ہی کا ایک حصہ ہے' اس لیے وہاں مسلمانوں کے قوانین نافذ نہیں ہیں۔ نظری طور پر اگرچہ دارالموادعہ ایک عارضی چیز ہے لیکن عملی طور پر احناف نے اسے بھی ایک جداگانہ قسم کی حیثیت سے تسلیم کیا ہے۔ یہ نظری جنگ بندی جیسا کہ آپ نے اوپر ابھی دیکھا ہے کہ صدیوں تک جاری رہی۔ اس سے یہ پتا چلتا ہے کہ احناف و شوافع کا اختلاف کوئی بنیادی اصولی اختلاف نہیں ہے' بلکہ اکثر و بیشتر محض اصطلاحات کے فرق سے عبارت ہے۔

اسی طرح کا ایک معاملہ حضرت علیؓ سے منسوب ہے جس کا ذکر ان کے مواعظ نہج البلاغہ میں موجود ہے۔ اس کی ثقاہت اور عدم ثقاہت کے بارے میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے' لیکن یہ حوالہ جو میں دے رہا ہوں' یہ درست معلوم ہوتا ہے۔ اگر من و عن بھی اس کو درست تسلیم کر لیا جائے تو کوئی قباحت نہیں۔ کیونکہ یہاں جو بات کہی جا رہی ہے وہ قرآن وسنت سے مطابقت رکھتی ہے۔ یہ حضرت علیؓ کا ایک خط ہے جو انھوں نے گورنر مصر کے نام لکھا تھا۔ مصر کی حدود اس دور میں لیبیا تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اس خط میں گورنر کو یاد دلایا گیا تھا کہ غیر جانب داری کے معاملات پر خاص توجہ دی جائے۔ انھوں نے لکھا کہ اگر تمھارا دشمن تمھیں صلح کی دعوت دے تو اسے کسی صورت مسترد نہ کرو۔ اس لیے کہ جب تم صلح کر لو گے تو تمھاری فوجوں کو تازہ دم ہونے کا موقع ملے گا اور تم کچھ اطمینان کا سانس لے کر آیندہ حالات کا بہتر تجزیہ کر سکو گے۔ نیز اس سے ملک کو امن و امان سے چلانے' عوام کی خدمت کرنے کا موقع فراہم ہو گا لیکن اس کے باوجود لکھا کہ ہر وقت دشمن سے چوکنا اور محتاط رہو۔

فقہاے کرام نے ایک سوال یہ اٹھایا ہے کہ کیا صلح کے تعلقات یا جنگ بندی کی کوئی مدت مقرر ہونی چاہیے؟ چنانچہ عام طور سے فقہاے احناف نے اس کی کم سے کم مدت چار ماہ مقرر کی ہے' یعنی کوئی موادعہ کم از کم چار ماہ کی مدت سے لے کر زیادہ سے زیادہ عرصے پر محیط ہو سکتا ہے۔ چار ماہ سے کم مدت کا معاہدہ عارضی موادعہ تصور ہو گا' گویا چار ماہ سے کم کا معاہدہ آج کی اصطلاح کے مطابق سیز فائر ہو گا اور اگر زیادہ ہے تو موادعہ یا مہادنہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ احناف اس پر قرآن پاک سے استدلال کرتے ہیں کہ مدت معاہدہ چار ماہ ہو' لیکن بہت سے فقہا نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔ زیادہ سے زیادہ مدت کے بارے میں فقہا نے کوئی خاص مدت مقرر نہیں کی' کم سے کم مدت کے لیے ان کا استدلال صفوان بن امیہ کے واقعہ پر مبنی ہے جو چار ماہ کے لیے تھا۔ اسی طرح بعض فقہا نے زیادہ سے زیادہ مدت دس سال بیان کی ہے' وہ کہتے ہیں کہ کوئی معاہدہ اس

سے زیادہ نہ ہونا چاہیے۔ یہاں ان کا استدلال صلح حدیبیہ سے ہے جس کی مدت دس سال مقرر کی گئی تھی۔ اکثر فقہا کا کہنا ہے کہ مدت کا تعین کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے کہ ضرور اس کا تعین کیا جائے۔ حالات کے مطابق علمائے وقت یا حکام اس کا اپنی صوابدید کے مطابق تعین کر سکتے ہیں۔ خود فقہائے احناف میں بھی اس سلسلے میں اختلاف ہے۔ مشہور محدث، فقیہ اور شارح بخاری علامہ بدر الدین عینی نے کہا ہے کہ یہ حکومت کی صوابدید پر ہے کہ اگر مسلمانوں کا مفاد مدت کے تعین میں ہو تو تعین کر لیا جائے اور اگر مسلمانوں کا مفاد مدت کے عدم تعین میں ہو تو مدت کو طے نہ کیا جائے۔ بخاری کی شرح میں انھوں نے یہی لکھا ہے لیکن اس بات میں کبھی بھی اختلاف نہیں رہا کہ جب مسلمانوں کا کسی دیگر فریق سے معاہدہ طے پا گیا تو اس معاہدے کی بنیاد پر تعلقات کا سارا دارومدار اور ان کی بقا کا انحصار ہو گا۔ غیر مسلم کی جان، مال اور عزت کو مکمل تحفظ دینا ہو گا اور اس کی کسی صورت خلاف ورزی نہ ہو گی۔

اسی طرح کا ایک معاہدہ سیدنا معاویہؓ کے زمانے میں رومیوں سے ہوا تھا اور اس معاہدے کے نتیجے میں وہ طویل جنگ ختم ہو گئی تھی جو رومیوں اور مسلمانوں کے درمیان رومیوں کی نالائقی کی بنا پر چھڑ گئی تھی۔ حضرت معاویہؓ نے پہلی بار اس معاہدے پر اپنے طور پر عمل کیا اور جس میں کم و بیش یہی شرائط رکھی گئی تھیں۔ یہ معاہدہ بھی تقریباً چھ سو سال تک جاری رہا جس میں طویل وقفوں کے بعد رومیوں کی طرف سے خلاف ورزی بھی ہوتی رہتی تھی، مثلاً صلیبی جنگوں میں ان کی طرف سے خلاف ورزی ہوئی۔ اس کے بعد جنگ طرابلس میں ان کی طرف سے خلاف ورزی ہوئی۔ پھر اسپین کی فتح کے بعد عثمانی ترکوں کے ساتھ انھوں نے معاہدے کیے اور ان کی خلاف ورزی کی۔

مواد عین کی جان و مال کے تحفظ کا لازمی تقاضا یہ بھی ہے اور یہ شریعت کا اصول ہے کہ اگر کسی ایسے علاقے کے غیر مسلم باشندے کی جان و مال کا نقصان ہو گا تو اس کا قصاص لیا جائے گا یا اس کو دیت دی جائے گی، دونوں میں سے کسی ایک کا تعین حالات اور معاملے کی نوعیت کے مطابق ہو گا۔ احناف کا کہنا ہے کہ مجرم سے قصاص لیا جائے گا جب کہ دیگر فقہا دیت کی ادائیگی کے قائل ہیں، لیکن جان و مال کے تحفظ پر سب کا اتفاق ہے۔ مشہور فقیہ امام سرخسی نے لکھا ہے کہ عارضی جنگ بندی کی صورت میں بھی مسلمان غیر مسلموں کی جان و مال، عزت و آبرو کے محافظ رہیں گے اور اس کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچائیں گے۔

اس سلسلے میں ایک بڑی نمایاں دستاویز جو شروع سے نظر آتی ہے اور جس کو مسلمانوں اور غیر مسلموں کے پر امن بقائے باہمی کے تعلقات کی بنیاد قرار دینا چاہیے، وہ دستاویز ہے جو رسولؐ اللہ نے یہودیوں کے ساتھ مرتب فرمائی جو میثاق مدینہ کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ بڑا دشوار ہے کہ آج کی آئینی یا قانونی دفعات کی شکل میں اسے بیان کیا جائے، لیکن یہ بات واضح ہے کہ اس دستاویز میں یہودی و مسلم قبائل دونوں کو اپنی

اپنی جگہ ایک قوم قرار دیا گیا اور ان کی اپنی اپنی داخلی خود مختاری کو تسلیم کیا گیا' مثلاً اس میں تسلیم کیا گیا کہ وہ اسی طرح اپنے علاقے کا نظام چلاتے رہیں گے جس طرح وہ اس معاہدے سے پہلے چلا رہے تھے اور وہ اپنے اپنے علاقے کے مالک اور مختار ہوں گے۔ یہ دفعات ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے ذریعے ایک ایسا نظام قائم کیا جا رہا ہے جس کو ایک نیم وفاقیہ کا نام دیا جا سکتا ہے' جس میں گویا دو خود مختار فریقوں نے مل کر یہ معاہدہ کیا تھا۔ اس میں اس بات کی وضاحت کی گئی تھی کہ اگر کسی دینی معاملے میں جنگ کی نوبت آئے تو یہودی مسلمانوں کی مدد کے پابند نہ ہوں گے۔ یہ بات بڑی اہم ہے اور اس کو غیر جانب داری کی مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ مسلمان دینی معاملے میں کسی غیر مسلم طاقت کی مدد نہ لیتے تھے اور نہ اسے پسند کرتے تھے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اگر ان کو بلایا جائے گا تو یہ ان کی ذمے داری ہو گی کہ وہ اس پر لبیک کہیں' سوائے اس معاملے کے کہ جس میں دین کے دفاع یا نفاذ کی بات ہو۔ یہودیوں کو اسلام کے اور مسلمانوں کو یہودی مذہب کے دفاع کے لیے نہیں بلایا جائے گا۔ ہاں اگر شہری ریاست کی سطح پر کوئی جنگ ہو گی تو فریقین باہمی تعاون کریں گے۔

آخر میں ایک ایسے پہلو کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے جو آج کل کے قوانین اور بین الاقوامی تعلقات کے لیے ناقابل تصور ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ آج کل کا دور نفاق کا دور ہے' دلوں میں کچھ ہوتا ہے اور زبانوں پر کچھ ہوتا ہے۔ دیانت داری اگر کوئی اختیار کرتا بھی ہے تو محض پالیسی کے طور پر۔ فقہاے اسلام کے بہت سے فتوے ہیں جن میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ جس بات پر عمل نہیں کرنا اس کو معاہدے میں نہ لکھا جائے' نہ کہا جائے اور نہ مانا جائے اور جس چیز کا ایک بار وعدہ کر لیا جائے' اس پر پوری باریک بینی سے عمل کیا جائے۔ اس بنا پر مسلمانوں نے جب یہ طے کیا کہ فلاں قوم سے معاہدہ کرنا ہے' وہ چاہے چھ سو سال کے لیے ہو یا چند لمحات کے لیے' تو انھوں نے یہ سوچ کر کیا کہ اس معاہدے کے تقاضے بہرصورت پورے کیے جائیں گے۔ ماوردی مشہور آئینی محقق ہیں' ان کی کتاب الحاوی الکبیر چوبیس جلدوں میں ہے' اس میں انھوں نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کا جب کسی ملک سے جنگ بندی کا معاہدہ ہو جائے اور حالات پرسکون اور پرامن ہو جائیں تو اس کے فریقین کے سامنے دو ہی راستے ہیں' یا تو پہلے سے اعلان کر کے نوٹس دے کر معاہدہ ختم کر دیں ورنہ اس کے تقاضوں پر عمل کریں۔ معاہدے پر عمل درآمد کے تین تقاضے ہیں:

۱- پہلا تقاضا یہ ہے کہ تمام معاملات میں مکمل جنگ بندی کی جائے' یعنی مسلمان ان سے جنگ نہ کریں اور ان کے جان و مال کو نقصان نہ پہنچائیں۔ جو حقوق اپنے لیے مسلمان مانگتے ہیں وہ ان کے لیے بھی پسند کریں' جو ذمے داریاں اپنے لیے قرار دیتے ہیں وہ ان کے لیے بھی قرار دیں۔ جیسے مسلمانوں کو اپنی آزادی عزیز ہے اسی طرح ان کے لیے ان کی آزادی کو پسند کریں اور معاملات کا وہی تصفیہ ان کے لیے ہو

جو اپنے لیے ہو۔

۲۔ دوسرا تقاضا یہ ہے کہ چھپ کر ان کے خلاف مسلمان خیانت یا غدر کا معاملہ نہ کریں۔ خفیہ طور پر ان کے خلاف کوئی کارروائی نہ کریں اور کوئی ایسا اقدام نہ کریں جس سے معاہدے کا وجود خطرے میں پڑ سکتا ہو۔

۳۔ تیسرا تقاضا یہ ہے کہ قول و فعل میں ان کے ساتھ مکمل مجاملہ کا سلوک کریں۔ یعنی ان کے ساتھ اخلاق، صفائی اور برابری کا معاہدہ۔ اگرچہ اس لفظ یعنی مجاملہ کا اردو میں ترجمہ مشکل ہے لیکن اس کی مثال جو ماوردی نے دی ہے اس سے اس کے مفہوم کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ وہ مثال یہ ہے کہ مسلمان ان کی غیبت اور عیب جوئی تک سے احتراز کریں، وہ مسلمانوں کی عیب جوئی نہ کریں، مسلمان ان کے خلاف کوئی پروپیگنڈہ نہ کریں اور وہ مسلمانوں کے خلاف اس قسم کا اقدام نہ کریں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اخلاق و کردار کا اس سے بڑا تصور آپ کو اور ہمیں کہیں نہ ملے گا۔

اسلامی تحریکیں: شرکت اقتدار کا تجربہ

محمد ظہیر الدین بھٹی

اسلامی تحریکوں کو کبھی دباؤ اور تشدد کا سامنا رہا‘ کبھی انھیں کالعدم قرار دیا گیا‘ کبھی وہ جیلوں کی تاریکیوں سے نکل کر سیاست کی روشنیوں میں پہنچیں‘ اپوزیشن کے بینچوں سے وزارت کی مسندوں تک پہنچیں بلکہ وزارت عظمیٰ کے اعلیٰ منصب تک ان کی رسائی ہوئی۔ کبھی انھیں دعوت و تبلیغ کی فکر تھی‘ کبھی ان کے شانوں پر مملکت کی ذمے داریاں آن پڑیں۔

کچھ ہفتے پہلے الجزائر کی تحریک "مجتمع السلم" قانون ساز اسمبلی کے تازہ انتخابات کے بعد بننے والی نئی حکومت میں شامل ہوئی ہے۔ اس سے کچھ پہلے نجم الدین اربکان نے ایک سال تک مخلوط حکومت کے تلخ تجربے کے بعد وزارت عظمیٰ کی کرسی خالی کر دی ہے۔ اس واقعے سے چند دن پہلے یمن کی التجمع للاصلاح شرکت اقتدار کے سنگھاسن سے اٹھ کر حزب اختلاف کی نشستوں پر جا بیٹھی۔ آزادی کویت کے بعد منعقد ہونے والے پہلے عام انتخابات کے بعد‘ حرکت دستوری اسلامی نے وزارت میں شمولیت اختیار کی۔ اسی طرح اُردن میں اخوان المسلمون نے مختصر مدت کے لیے ایک بار وزارت میں شرکت کی۔

ترکی‘ الجزائر‘ کویت‘ اردن اور یمن میں ہم عصر اسلامی تحریکوں کے شرکت اقتدار کے یہ تجربات کیسے رہے؟ ان کے مثبت اور منفی پہلو کیا ہیں؟ اس تجربے میں شامل ہونے والے کیا کہتے ہیں؟ ان کے بارے میں دوسرے لوگوں کی کیا رائے ہے؟ المجتمع ۱۲۵۸‘ ۱۵ تا ۲۱ جولائی ۱۹۹۷ کے اس مضمون میں ان پانچ ممالک میں ہونے والے پانچ تجربات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اسلامی تحریکوں کے تجربات کا مکمل جائزہ پیش نظر نہیں ہے بلکہ محض دوسری پارٹیوں کے ساتھ مل کر--- مخلوط حکومت کے ذریعے اقتدار میں شرکت ہمارا موضوع ہے۔

ترکی

صدر رفاہ پارٹی‘ نجم الدین اربکان نے مخلوط حکومت کی سربراہی سے استعفا دے دیا ہے۔ ترکی کے صدر سلیمان ڈیمرل نے مدر لینڈ پارٹی کے صدر مسعود یلماز کو نئی حکومت بنانے کی دعوت دی ہے جس نے ۱۲

جولائی ۱۹۹۷ کو پارلیمنٹ سے اعتماد کا ووٹ لیا۔ ییلماز کی حکومت کا کیا انجام ہو گا؟ اس سے قطع نظر آیئے یہ دیکھیں کہ اربکان کی حکومت سے تحریک اسلامی کو کیا فوائد و نقصانات پہنچے۔ بات صرف اتنی نہیں کہ حکومت بنی، ایک سال کے بعد مستعفی ہو گئی اور بس! بات اس سے زیادہ گہری ہے۔ آیئے اس کا جائزہ لیں۔

۱- جدید ترکی مملکت، دولت عثمانیہ کے کھنڈرات پر کھڑی ہوئی ہے۔ اس کے بنیادی رکن، قومیت اور سیکولرازم ہیں۔ قومیت سے مراد ترکی قومیت اور ترکی زبان کا غلبہ جبکہ سیکولرازم سے مراد اسلامی عناصر سے نبرد آزمائی ہے۔ ۱۹۲۳ میں "جمہوریت" قائم ہوئی جس نے خلافت کو کالعدم قرار دیا اور اسلامی شرعی قوانین کی جگہ یورپی قوانین اپنائے گئے۔ تمام دینی مدرسے بند کر دیے گئے۔ یہ سب کچھ بتدریج اور عوام کی رضامندی سے نہیں ہوا بلکہ اس کے لیے دباؤ، تشدد اور قتل و خونریزی سے کام لیا گیا۔ اس طویل تاریک دور استبداد میں "ڈیماکریسی" کا غلغلہ بلند ہوا۔ متعدد سیاسی پارٹیاں بھی وجود میں آئیں۔ مغربی آزادی نے راہ پکڑی۔ یہ تاثر عام ہوا کہ ترکی میں مکمل جمہوری آزادیاں ہیں۔ کہا جانے لگا کہ مشرق وسطیٰ میں صرف دو جمہوری ملک ہیں: ایک اسرائیل اور دوسرا ترکی۔ حکومت اربکان نے اس غلط تاثر کی قلعی کھول دی۔ دنیا نے دیکھ لیا کہ ترکی ابھی تک فوج کی گرفت میں ہے۔ فوج ہی اقتدار کا سرچشمہ ہے۔ اسی کے ہاتھ میں ڈوری ہے، وہی ڈوری ہلاتی ہے۔ ۱۹۶۰، ۱۹۷۰ اور ۱۹۸۰ کے انقلابات نے اگر کبھی ایک سال یا دو سال کے لیے جمہوری نظام کی اجازت دی تو وہ الگ بات ہے۔ مگر اب یہ حالت نہیں رہی، اب ترکی میں سیاسی طور پر مضبوط اسلامی قوت وجود میں آ چکی ہے اور ملک حقیقتاً ایک نئے مرحلے میں داخل ہو چکا ہے۔

۲- ترکی کی دائیں اور بائیں بازو کی پارٹیوں کے بارے میں یہ حقیقت واضح ہو گئی ہے کہ وہ حزب اختلاف میں ہوں یا حزب اقتدار میں، وہ حقیقی حکمران گروہ (یعنی فوج) کے لیے محض قافیہ ملانے کا کام کرتی ہیں۔ انھیں جمہوریت سے کوئی دلچسپی نہیں۔ ان کی حالت یہ ہے کہ جمہوریت کی علم بردار رفاہ پارٹی کی حکومت ختم کرانے کے لیے انھوں نے فوج سے مداخلت کی اپیل کی تاکہ فوج آگے بڑھے اور رفاہ کا تختہ الٹ دے۔ افسوس کہ عوام کی بالادستی کے نام پر بننے والی پارلیمنٹ میں جانے والی پارٹیوں نے عوامی حکومت کے خلاف فوج سے مدد کی درخواست کی۔

۳- اس تلخ حقیقت کا انکشاف ہوا کہ رفاہ کی حکومت کے خلاف جنگ کی قیادت ذرائع ابلاغ نے کی۔ یہ ایک ایسا پریشر گروپ ہے جو اقتصادی، تجارتی اور ابلاغی ہتھیاروں سے مسلح ہے اور جو ملک کی رائے عامہ کو بدلنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ جس طرح یہودی مغرب کے اہم ذرائع ابلاغ پر قابض ہیں۔ اسی طرح ان کے ایجنٹ ان کے ماتحت ملکوں میں زبردست اثر و رسوخ کے مالک ہیں۔ ملک کی اصل حکمران قوت نے تو رفاہ پارٹی کو چند ماہ کے لیے برداشت کر لیا مگر ذرائع ابلاغ نے اسے ایک دن کے لیے بھی برداشت

نہیں کیا۔ یہ ذرائع ابلاغ جھوٹ' فریب اور حقائق مسخ کرنے کے ہتھیاروں سے مسلح ہیں۔ تانسو چیلر نے جب اعلان کیا کہ سابقہ حکومتیں ذرائع ابلاغ کو کئی ملین ڈالر محض اس لیے پیش کر چکی ہیں کہ وہ ان کی حکومتوں کو عوام کے سامنے خوشنما بنا کر پیش کریں تو اس اعلان کے بعد ذرائع ابلاغ مخلوط حکومت کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے۔

۴ - رفاہ پارٹی کی تمنا تھی --- اور اس کی اس خواہش میں دنیا بھر کے تمام اسلام پسند بلکہ انصاف پسند سیکولر بھی شریک تھے --- کہ ترکی اپنے اسلامی تشخص کو ابھارے اور عالم اسلام اور یورپ کے مابین ایک پل کا کام دے۔ رفاہ چاہتی تھی کہ وہ مسلموں اور غیر مسلموں کے مابین رواداری اور باہمی احترام پر مبنی خیر سگالی کے تعلقات قائم کرنے کی ایک عمدہ مثال قائم کرے۔ مگر معلوم ہوا کہ جس طرح مغرب "اسلامی انتہا پسندی" سے خائف ہے اسی طرح وہ "اسلامی اعتدال پسندی" سے بھی خوش نہیں ہے' بلکہ وہ اسلامی اعتدال پسندی سے کچھ زیادہ ہی الرجک ہے۔

درج بالا حقائق سے ہم مستقبل کے بارے میں یہ اندازے لگا سکتے ہیں:

۱- دنیا سے کیمونزم کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ ترکی میں کمالی تجربہ دراصل سوشلزم کی ہی ایک شکل ہے جس میں فرد کو آزادی نصیب نہیں ہوتی' وہ غلام ہوتا ہے۔ کمال ازم میں "جمہوریت" کا نام تو ضرور لیا جاتا ہے مگر اس پر عمل نہیں ہوتا۔ بہرحال کمال ازم کو زوال کا سامنا ہے۔ ایسا ہو کر رہے گا۔ تاریخ کی یہی منطق ہے۔

۲ - لادینی عناصر کی طرف سے پڑنے والے دباؤ کی وجہ سے ماضی میں مسلمانوں نے دائیں بازو کی پارٹیوں کے سائے تلے پناہ لی۔ ابھی تک دیندار مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد ان پارٹیوں سے وابستہ ہے' خاص طور پر ٹروپاتھ پارٹی اور مدرلینڈ پارٹی سے توقع ہے کہ آگے چل کر ایک متحدہ محاذ تشکیل دینے میں ان اسلامی عناصر سے تقویت ملے گی۔ مسلح افواج نے جب مطالبہ کیا کہ "امام و خطیب اسکول" بند کر دیے جائیں تو اس کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے صرف رفاہ پارٹی سے وابستہ لوگ ہی میدان سلطان احمد میں جمع نہیں ہوئے تھے بلکہ ان کے ساتھ دوسری پارٹیوں کے لوگ بھی تھے۔ بعض اوقات شر میں خیر بھی مضمر ہوتا ہے۔ رفاہ کے اقدام نے مسلمانوں کو متحدہ محاذ بنانے پر آمادہ کر دیا ہے۔

۳ - انتخابات جلد ہوتے ہیں یا نہیں؟ فوج مارشل لا لگا کر اقتدار سنبھالتی ہے یا نہیں؟ اربکان ایک بار پھر برسر اقتدار آتے ہیں یا نہیں؟ کچھ بھی ہو مگر ترک عوام اربکان کو کبھی فراموش نہ کر سکیں گے۔ شر و باطل کی تمام طاقتیں' تمام جھوٹے ذرائع ابلاغ' بیوروکریسی اور سیاسی پارٹیوں کی گمراہ کن پروپیگنڈہ مہم بھی اربکان کے کارناموں کو محو نہیں کر سکے گی۔ عوام نہیں بھولیں گے کہ اربکان نے قوم کے مال کے ساتھ

خیانت نہیں کی، نہ وہ کسی ملی بدعنوانی میں ملوث ہوئے۔ اقتدار سنبھالنے کے اگلے دن ہی تنخواہوں میں اضافہ کیا۔ کم از کم اجرت کی مقدار میں اضافہ کیا۔ فضول خرچی اور اسراف کا خاتمہ کر دیا۔ بڑے اسلامی ممالک پر مشتمل ایک عالمی اقتصادی ادارہ قائم کیا جس کا مرکز استنبول ہو گا۔ ایک متوازن بجٹ پیش کیا۔ بیرون ملک سے قرضہ لیا نہ درون ملک سے۔ نئے ٹیکس نہیں لگائے۔ اربکان کے بلدیاتی اداروں نے عوامی فلاح و بہبود کے لیے وہ کچھ کیا جس کا کرنا دوسری پارٹیوں کے لیے محال تھا۔

یہ شفاف طرز حکومت اور قومی خزانے کا دیانت سے استعمال ترکی کی تاریخ کا ایسا نادر واقعہ ہے کہ عوام اسے برسوں تک یاد رکھیں گے۔

ترکی کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ پورے ملک پر صرف پانچ سو افراد کا قبضہ ہے، وہی حکومت کر رہے ہیں، وہی ترکی کے مال و دولت سے مستفید ہو رہے ہیں۔ کچھ حلقوں نے اس اندیشے کا اظہار کیا ہے کہ کردوں کے خلاف مسلسل لڑائی جاری رکھنے کے پس پردہ موجودہ اور سابقہ جرنیلوں کے مفادات وابستہ ہیں۔ یہ لوگ اسلحے کے بیوپاریوں سے سازباز کر کے کئی ملین ڈالر کما رہے تھے۔ اسلحہ اور اس کے سودوں میں ہیر پھیر کی افواہ بھی عام ہے۔

۴۔ سوسرلک کے سانحے کی تحقیقی رپورٹ منظر عام پر آئے گی تو دنیا کو اصل حقیقت معلوم ہو گی کہ کس طرح ایک طاقتور مافیا جوے خانوں، منشیات اور چوری چکاری کے اڈوں کی سرپرستی کرتا ہے۔ عوام کو یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ صدر ڈیمرل نے جوے کے اڈوں کی بندش کے مخصوص قانون پر دستخط کیوں نہیں کیے۔ سوسرلک کے سانحے کے بعد وزیر داخلہ نے استعفا کیوں دیا؟ کیوں صدر ڈیمرل ایک مافیا لیڈر، انجی بابا کے مقدمے میں دلچسپی لے رہے تھے۔

۵۔ عوام جان لیں گے کہ گذشتہ ستر سال میں اربکان پہلا شخص تھا جس نے فوج سے کہا: "تمھارے آرڈرز حکم نہیں بلکہ محض تجاویز ہیں۔ اصل حکمران تم نہیں ہو بلکہ عوام ہیں۔ پارلیمنٹ ذریعہ حکم ہے، جبکہ حکم دینے کا حق صرف وزیراعظم کو ہے۔ فوج کا کام حکومت کی اطاعت ہے، حکومت پر برتری اور تسلط نہیں"۔ فوج کو بھی جلد ہی معلوم ہو جائے گا کہ اس نے نفع سے زیادہ نقصان کا سودا کیا ہے۔ رفاہ، فوج کی خیرخواہ تھی۔

بعض حضرات رفاہ کی شرکت اقتدار کی پالیسی پر تنقید کرتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ اقتدار میں آکر رفاہ نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ اس نے تجارتی حلقوں سے اپنا تعلق بڑھایا ہے۔ اسے ترکی کی مقامی اور بین الاقوامی اصل پوزیشن سے آگہی ہوئی ہے۔ اب اگر رفاہ آیندہ پانچ یا دس برس اپوزیشن میں بھی رہے تو اس کی عوامی تائید و حمایت میں کمی نہیں ہو گی بلکہ اضافہ ہی ہو گا۔ وہ بھاری اکثریت سے جیت کر تنہا حکومت بنا

لے گی۔ کچھ حلقوں نے اس اندیشے کا اظہار کیا ہے کہ اگر عدالت عظمیٰ نے رفاہ کو کالعدم قرار دیا تو وہ تشدد کا راستہ اپنائے گی۔ رفاہ اس قسم کی پارٹی نہیں ہے، اس کے سامنے کام کے بہت سے دروازے کھلے ہیں۔ اگر وہ ۱۹۹۵ کے عام انتخابات میں ۲۱.۷ فی صد ووٹ لے کر سب سے زیادہ ووٹ حاصل کرنے والی پارٹی تھی تو آیندہ انتخابات میں بھی وہ بھاری اکثریت سے جیتے گی۔

الجزائر

الجزائر پر گفتگو شرکت اقتدار کی نہیں، تشکیل حکومت کی ہونا چاہیے تھی۔ یہ تجربہ دنیا بھر کی اسلامی تحریکوں کے لیے راہ نما تجربہ ہوتا لیکن اسلامی محاذ نجات (FIS) کو کامیابی کے باوجود حکومت نہیں بنانے دی گئی اور الجزائر خون میں نہا گیا۔ اب اسلامی فرنٹ کی شرکت کے بغیر جو انتخابات اور شرکت اقتدار کا تجربہ ہے، اس کا جائزہ پیش خدمت ہے لیکن اس حقیقت کو پیش نظر رکھا جائے کہ الجزائر میں ابھی تک کوئی حقیقی جمہوریت وجود میں نہیں آسکی۔

گذشتہ ۵ جون کو ہونے والے قانون ساز اسمبلی کے انتخابات کے بعد حركة مجتمع السلم: تحریک پرامن معاشرہ کے پانچ وزرا نئی حکومت میں شامل ہوئے۔ اس سے پہلے ۱۶ نومبر ۱۹۹۵ کو ہونے والے صدارتی انتخابات کے بعد کثیر الجماعتی حکومت میں دو وزیروں نے مجتمع کی نمایندگی کی۔ اس پارٹی نے حکومت میں شرکت اس لیے کی ہے کہ الجزائر کو موجودہ بحران سے نکالا جا سکے جس کی نذر تقریباً ۷۰ ہزار افراد ہو چکے ہیں۔ حركة مجتمع السلم ان دو سیاسی پارٹیوں میں سے بڑی ہے جنھیں سیاسی سرگرمیوں کی اجازت ہے۔ صدارتی انتخابات میں تحریک کے سربراہ محفوظ نحناح نے ۳ ملین ووٹ حاصل کیے تھے اور اسمبلی کے انتخابات میں ۷۲ نشستیں جیتی ہیں۔ محفوظ نحناح شریعت اسلامیہ انسٹی ٹیوٹ کے فارغ التحصیل ہیں۔ آپ ۱۹۹۲ سے الجزائر میں جنم لینے والے سیاسی بحران اور اس میں تشدد اور قتل و غارت کی سخت مذمت کرتے چلے آئے ہیں۔ آپ کی جماعت نوجوانوں اور خصوصاً یونی ورسٹی کے فارغ التحصیل طلبہ پر خصوصی توجہ دیتی ہے۔ وہ قومی مفادات کے تحفظ کی خاطر حکومت سے رابطے اور مخلوط حکومت میں شرکت کے حق میں ہے۔ اس پارٹی کا پہلا نام "حركة المجتمع الاسلامی (حماس) تھا مگر وزارت داخلہ نے اسے جدید پارٹی ایکٹ کی پابندی پر مجبور کیا۔ ۶ مارچ ۱۹۹۷ کو جاری ہونے والے پارٹی ایکٹ کے بموجب اسلام اور عروبہ کے ناموں کو سیاسی اغراض و مقاصد کے لیے استعمال کرنا ممنوع ہے۔ چنانچہ نیا نام حركة مجتمع السلم (حماس) رکھا۔ یہ جماعت جدید سیاسی حکمت عملی سے بہرہ ور ہے۔ تحریک النہضۃ الجزائر کی دوسری بڑی اسلامی پارٹی ہے۔ اس کے سربراہ شیخ عبداللہ جاب اللہ ہیں۔ اس نے گذشتہ انتخابات میں ۳۴ نشستیں جیتیں۔ شیخ عبداللہ لا کالج کے فارغ التحصیل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ اور آپ کی پارٹی کے دیگر زعما سیاسی

حالات کا سماجی اور قانونی جائزہ لیتے اور ان کا تجزیہ کرتے ہیں۔

ان دونوں اسلامی پارٹیوں نے سیاسی مذاکرات سے کبھی انکار نہیں کیا۔ یہ دونوں جماعتیں الجزائر کو خونریزی اور فساد سے محفوظ رکھنے کے لیے مکمل تعاون کے لیے ہمہ وقت تیار ہیں۔

مجتمع کے راہ نماؤں کے بقول شرکت اقتدار سے ان کا اہم ترین مقصد ---- گذشتہ عشروں میں بائیں بازو کی پیدا کردہ غلط فہمیوں کا ازالہ ہے۔ نیز ان کے اندیشوں کا پردہ چاک کرنا ہے۔ سیکولر گروہ کے ان شکوک و شبہات کا ازالہ کرنا ہے جو انھوں نے بیورو کریٹس کے دل و دماغ میں بٹھا دیے تھے۔ صدارتی انتخابات کے بعد بننے والی حکومت میں ہماری شرکت سے قبل سیکولر لوگ کہا کرتے تھے کہ حماس کا وزیر اپنے دفتر وزارت کو مسجد میں بدل دے گا۔ وزارت کو اپنی پارٹی کے مفادات کے لیے استعمال کرے گا۔ وہ موجودہ تمام عملے کو ہٹا کر اپنی پارٹی کے لوگوں کو ملازمتیں دے گا۔ حالانکہ ایسا نہ ہمارے سابقہ دور وزارت میں ہوا نہ ہی موجودہ مخلوط حکومت میں ہو گا اور نہ ہی مستقبل میں اس کا امکان ہے۔ لہٰذا حرکۃ حماس کا اقتدار میں شرکت کا ایک مقصد سرکاری ملازمین کے لاشعور میں اسلام کے بارے میں جاگزیں تصورات کو درست کرنا ہے۔

تحریک کے سربراہ کے بقول ---- مخلوط حکومت میں شمولیت کا مطلب صدر مملکت کی اتباع نہیں ہے۔ صدر جمہوریہ نے نومبر ۱۹۹۵ میں ہونے والے صدارتی انتخابات سے پہلے جس منشور کا اعلان کیا تھا وہ ہماری جماعت کے منشور سے کافی مشابہت رکھتا ہے۔ اس لیے ہم اقتدار میں شامل ہوئے ہیں۔ شخصیتیں آنی جانی چیز ہیں، ادارے قائم رہتے ہیں۔ دہشت گردوں کو مملکت الجزائر اور حکومت الجزائر میں فرق کرنا چاہیے۔ درد سر کا علاج، سر کو ختم کرنا نہیں ہے۔ مریض، مرض اور مرض کے جراثیم میں فرق کرنا چاہیے۔ حکومت میں تحریک اسلامی کی نمایندگی کرنے والے ایک سابق وزیر نے بتایا کہ سابقہ حکومت میں ہماری شمولیت "باہمی تعارف" کی حد تک تھی۔ یہ الجزائر کی تاریخ میں اپوزیشن کے ساتھ مل کر بننے والی پہلی مخلوط حکومت تھی۔ اس لیے ابتدا میں کام مشکل تھا مگر بتدریج آسان ہو تا گیا۔

ابو جرہ سلطانی کہتے ہیں: "میں پہلے باہر رہ کر حکومت پر تنقید کرتا تھا مگر اب حکومت کے اندر رہ کر اس پر تنقید کرتا ہوں۔ جگہ بدل گئی ہے، موقف تبدیل نہیں ہوا"۔

سوشلسٹ اور لادین عناصر کو ان پارٹیوں کی حکومت میں شرکت ایک آنکھ نہیں بھائی۔ ان کے خیال میں یہ بنیاد پرستوں کو سرکاری سطح پر آگے بڑھنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ چنانچہ سوشلسٹ فرنٹ کے لیڈر حسین آیت احمد نے کہا ہے: "اخوان کے نخلاح اقتدار پر اس طرح قبضہ کر لیں گے جس طرح سوڈان میں ترابی نے چند وزارتیں حاصل کرنے کے بعد براہ راست اقتدار پر قبضہ کر لیا"۔ بربر لیڈر سعید سعدی کہتے ہیں

کہ حکومت میں اخوان المسلمون کے سات وزرا کی شمولیت کا مطلب وطن پرستوں اور اسلامی قوتوں میں سودا بازی ہے تاکہ اس طرح جمہوری قوتوں کا راستہ روکا جاسکے اور فکری و ثقافتی ترقی کو روکا جائے۔ اس ضمن میں عبداللہ جاب اللہ کا یہ کہنا زیادہ اہم ہے کہ "ہم اپنی تحریک کی سیاسی اور انتخابی ساکھ کو حکومت کی ساکھ بہتر بنانے کے لیے استعمال کرنے کے خلاف ہیں"۔

کسی بھی سیاسی پارٹی کی کوئی بھی حرکت مضر یا مفید ہوا کرتی ہے۔ سیاسی میدان کے اس اصول سے تحریک مجتمع السلم بھی مستثنیٰ نہیں۔ پہلا نقصان یہ ہوا ہے کہ شدت پسندوں کے خلاف' تحریک کے سربراہ محفوظ نحناح کے تیز و تند بیانات کی وجہ سے ان کی شدت پسندانہ کارروائیوں میں اضافہ ہوا ہے۔ دوسرا نقصان یہ ہے کہ تحریک کی قیادت ۱۹۹۲ سے لے کر اب تک سیاسی کاموں میں اس قدر مصروف رہی ہے کہ وہ اپنی رفاہی' ثقافتی اور تعلیمی سرگرمیوں پر کماحقہ' توجہ نہیں دے سکی۔ اگرچہ اسے عالم اسلام اور دنیاے عرب کی سطح پر پذیرائی ملی ہے' سیاسی میدان میں بھی آگے بڑھی ہے مگر وہ اپنے ملک میں رفاہی و فلاحی امور سے لاتعلق ہوتی جارہی ہے۔

توقع ہے کہ سال رواں کے آخر میں ہونے والی تحریک اسلامی کی کانفرنس میں ان امور کے حوالے سے تحریک کی کارکردگی پر نظرثانی کی جائے گی۔ امیر تحریک اس کانفرنس میں "نئی نسل پر مبنی ایک نیا قومی بیورو براے عمل درآمد" تشکیل دینے کا اعلان کریں گے جبکہ موجودہ بیورو کے ارکان' پارلیمنٹ اور حکومتی سرگرمیوں تک محدود رہیں گے۔

حکومت نے المجتمع کو اقتدار میں شریک کیا ہے یا المجتمع نے اقتدار میں شمولیت اختیار کی ہے تو دونوں کے پیش نظر اپنے اپنے مفادات ہیں۔ حکومت کے بنیادی مقاصد یہ ہیں:

(الف) حکومت اپنے سالانہ بجٹ کو متوازن بنانے کے لیے بین الاقوامی سطح پر امداد اور قرضے حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ جمہوری عمل جاری کرے۔ چنانچہ اس نے "مجتمع السلم" اور "التجدید الجزائری" پارٹی کو مخلوط حکومت میں شرکت کی دعوت دی۔ (ب) کئی سیاسی پارٹیوں نے قانون ساز اسمبلی کے انتخابات کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا تھا۔ صدارتی انتخابات کے بعد مجتمع کو اقتدار میں شریک کرلینے سے ان پارٹیوں کا بائیکاٹ بے اثر ہو کے رہ گیا۔ عوام نے صدارتی اور پارلیمانی انتخابات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ (ج) حکومت تحریک اسلامی کو اقتدار میں شامل کرنے پر اس لیے مجبور تھی کہ اسے خطرہ تھا کہ سیاسی عمل سے باہر رہنے کی صورت میں تحریک حکومت کے لیے بہت سی مشکلات پیدا کرسکتی ہے۔

مجتمع کے پیش نظر مقاصد یہ ہیں:

(الف) اسلام اور تحریک اسلامی کے بارے میں اس تاثر کو غلط ثابت کرنا کہ وہ دہشت گردی اور شدت پسندی کے سرپرست ہیں۔ اسی لیے صدارتی الیکشن کے بعد دو اور پارلیمانی انتخابات کے بعد سات وزرا نے حکومتی ذمے داریاں سنبھالیں۔ اس صورت میں دہشت گردوں کے ساتھ ان کے ربط و تعلق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ (ب) اس سوچ کو تقویت پہنچانا کہ تحریک اسلامی کے وزرا سماجی اور اقتصادی مشکلات و موانع کے حل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ نیز یہ کہ اگر تنہا تحریک اسلامی کو حکومت بنانے کا موقع ملا تو وہ بطریق احسن کاروبار حکومت کو چلا سکے گی۔ یعنی اسلامی تحریک متبادل حکومت کی اہل ہے۔ (ج) تمام سرکاری اداروں اور محکموں میں اپنا اثر و رسوخ بڑھایا جائے۔ یہ ادارے اب تک "سیکولر ازم" اور مغربی جمہوریت کے حامیوں کے زیر تسلط رہے ہیں۔

کویت

کویت دیگر برادر مسلم و عرب ممالک سے اس لحاظ سے منفرد ہے کہ یہاں کی حکومت اور تحریک اسلامی میں خوش گوار تعلقات ہیں۔ یہاں پکڑ دھکڑ، ظلم و تشدد اور قید و بند کی اذیتیں نہیں ہیں۔ یہاں پہلی بار ۱۹۹۲ میں تحریک اسلامی نے حکومت میں شرکت کی۔ ۱۹۹۲ میں ہونے والے انتخابات میں کویت کی پارلیمنٹ کی دو تہائی نشستیں تحریک اسلامی اور ان کے حامیوں نے جیتیں۔ مخلوط حکومت میں انھیں تین وزارتیں ملیں۔ یہ وزرا تھے: جمعان الجازی، ڈاکٹر عبداللہ الماجری اور جاسم العون۔ پہلے کویت کے ارکان پارلیمنٹ میں سے صرف ایک وزیر لیا جاتا تھا مگر اب کی بار چھ وزرا لیے گئے ہیں۔ جمعان الجازی نے عربی ہفت روزہ **المجتمع** سے اپنے ایک انٹرویو میں کہا:

"حکومت میں شریک ہونے کی وجہ سے بہت سی باتیں ہماری سمجھ میں آئی ہیں۔ ہم ایک عام شہری کی تکالیف اور مسائل کو اب آسانی سے سمجھ چکے ہیں۔ ہم نے ایک شاہی فرمان کے ذریعے جنرل سیکرٹری آفس برائے وقف قائم کیا ہے جس کی وجہ سے اوقاف کی کارکردگی میں ہمہ گیری اور وسعت پیدا ہوئی ہے۔ ہم نے مساجد کے ائمہ و خطبا اور وزارت اوقاف کے افسران سے ملاقاتیں کرنے کے بعد دعوت و ارشاد کے کام کو آگے بڑھایا ہے۔ ہم نے عالم اسلام کی مسلم تنظیموں سے مضبوط رابطے قائم کیے ہیں اور ہر طرح سے ان کی مدد کر رہے ہیں۔ عالم اسلام کے علما و محققین سے ہمارا رابطہ ہے تاکہ ہم **موسوعہ فقہیہ** (فقہی انسائیکلوپیڈیا) کی تکمیل کر سکیں۔ ہم ہر درپیش مسئلے پر اپنا نقطہ نظر پارلیمنٹ میں پیش کرتے ہیں۔ ہمیں سرکاری منصوبوں پر عمل درآمد کا طریق کار معلوم ہوا ہے۔ نیز سرکاری امور کو نبٹانے سے آگاہی ملی ہے۔ کاروبار حکومت چلانے کا عملی تجربہ ہوا ہے۔ ہم نے وزارت تعلیم کو اس بات پر آمادہ کر لیا ہے کہ وہ یونی ورسٹی ایکٹ منظور کرے جس کی رو سے مخلوط تعلیم کا خاتمہ ہو سکے اور یونی ورسٹی میں خواتین کی تعلیم کے

لیے الگ باپردہ انتظام کیا جا سکے۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ یونی ورسٹی بھی اس پر آمادہ ہے۔ ہم ذرائع ابلاغ کا قبلہ درست کرنے کے لیے بھی تگ و دو کر رہے ہیں تاکہ مخرب اخلاق پروگراموں پر پابندی عائد کی جا سکے۔ پارلیمنٹ نے ایک کمیٹی برائے نفاذ قوانین شریعت تشکیل دی ہے۔ اس کمیٹی کے سربراہ سے درخواست کی گئی ہے کہ یہ کمیٹی بنک کاری، تجارتی اور اقتصادی امور کے بارے میں تمام قوانین کو شریعت کے مطابق ڈھالنے کا کام جلد از جلد پایہ تکمیل تک پہنچائے"۔ کویت کے سابق وزیر نعمان العازمی نے اپنے انٹرویو میں شرکت اقتدار کے نقصانات کا بھی ذکر کیا ہے وہ کہتے ہیں: حکومت میں شرکت کرنے یا نہ کرنے سے متعلق ہمارے ہاں دو آرا پائی جاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ممبران پارلیمنٹ عوام کی مشکلات کو زیادہ بہتر طور پر سمجھتے ہیں اس لیے حکومتی فیصلوں میں ہمارے ارکان پارلیمنٹ کو شریک ہونا چاہیے جبکہ دوسری رائے یہ ہے کہ ممبران پارلیمنٹ کو حکومت کا حصہ بن کر شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اس کی رائے حکومتی رائے سے مختلف ہوتی ہے لیکن اسے اپنی حکومت کی رائے کے احترام میں اپنی زبان بند رکھنا پڑتی ہے اور اس پر اسے عوام کی لعنت ملامت کا شکار ہونا پڑتا ہے۔

اردن

اردن میں تحریک اسلامی ۵۰ کے عشرے میں منظر عام پر آئی۔ اس نے پہلی بار ۱۹۵۶ کے انتخابات میں شرکت کی تو اسے چار نشستیں ملیں۔ ۶۳ اور ۶۷ کے الیکشن میں دو دو نشستیں ملیں۔ ۸۹ کے انتخابات میں پارلیمان کی کل ۸۰ سیٹوں میں سے تحریک اسلامی کو ۲۲ نشستوں پر کامیابی حاصل ہوئی۔

۱۹۸۹ کا سال اردن کے لیے سیاسی تغیر کا سال ثابت ہوا جب تحریک اسلامی نے دعوت و تربیت کے مرحلے سے آگے بڑھ کر پارلیمنٹ کے سیاسی عمل میں شرکت کی۔ تحریک اسلامی کے ایک رہنما ڈاکٹر عبداللہ العکایلہ کی رائے میں تحریک اسلامی ۸۹ میں ہی مقامی طور پر ایک بڑی سیاسی قوت بن کر ابھری۔ اس سے پہلے کی چار دہائیوں میں تو اس کی سرگرمیاں صرف پارلیمنٹ کے اندر تک محدود تھیں۔

تحریک اسلامی کو پارلیمان میں ۲۲ نشستیں ملی تھیں۔ اسے دس مزید حامیان اسلام ارکان پارلیمنٹ کی بھی حمایت حاصل تھی۔ اس صورت حال کے پیش نظر وزیراعظم مضر بدران کے لیے ---- جنھیں نئی حکومت تشکیل دینے کی ذمے داری سونپی گئی تھی ---- تحریک اسلامی اور اس کے حامیوں کو نظرانداز کرنا مشکل ہو گیا۔ چنانچہ انھوں نے فوراً رابطہ کیا اور تحریک اسلامی کو اقتدار میں شرکت کی پیش کش کی۔ فریقین کے مابین ہونے والے مذاکرات کسی نتیجے پر نہ پہنچ پائے کیونکہ وزیراعظم نے تحریک اسلامی کو سات وزارتوں کے قلم دان ---- جن میں وزارت تربیت و تعلیم بھی تھی ---- سونپنے سے انکار کیا تھا۔ تاہم وزیراعظم نے تحریک اسلامی کو حکومت میں لانے کے لیے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ اس پر تحریک نے ۱۴ شرطیں عائد کیں۔

ان میں سے ایک شرط تھی: زندگی کے تمام شعبوں میں شریعت اسلامی کا نفاذ۔ بدران نے یہ شرطیں منظور کیں۔ یوں وہ ایوان سے اعتماد کا ووٹ حاصل کرنے کے لیے تحریک اسلامی کی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ مگر تحریک اسلامی حکومت سے باہر ہی رہی۔ یہ ایک عجیب صورت حال تھی۔ اس صورت حال سے نکلنے کے لیے پھر مذاکرات ہوئے جو کامیاب ہوئے۔ یوں اردن میں پہلی بار تحریک اسلامی نے ۱۹۹۰ میں حکومت میں شرکت کی۔ اسے پانچ وزارتوں کے قلم دان سونپے گئے یعنی وزارت تعلیم و تربیت، عدل، صحت، سماجی ترقی اور اوقاف مگر یہ مخلوط حکومت صرف چند ماہ چل سکی۔ جلد ہی حکومت نے میڈرڈ کانفرنس میں اردن کی شرکت کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے استعفیٰ دے دیا۔ اس سے پہلے تحریک اسلامی نے یہ دھمکی دی تھی کہ اگر حکومت اردن نے اسرائیل کے ساتھ مذاکرات کیے تو اس کے تمام وزرا مستعفی ہو جائیں گے۔

اس واقعے کے چھ سال بعد یعنی اب تک تحریک اسلامی نے کسی بھی اردنی حکومت کو اپنی حمایت کا یقین نہیں دلایا نیز وزرائے اعظم کی جانب سے کی جانے والی تمام پیش کشوں کو مسترد کر دیا ہے۔

اردن میں اخوان المسلمون کے المراقب العام ایڈووکیٹ عبدالمجید الذنیبات نے شرکت اقتدار کے بارے میں کہا:

"جماعت کی اقتدار میں شمولیت کی مدت بہت مختصر تھی جو پانچ ماہ سے متجاوز نہیں ہوئی۔ حالات دگرگوں تھے۔ جنگ خلیج جاری تھی۔ داخلی حالات بھی ابتر تھے۔ کچھ طاقتیں اخوان کے درپے آزار تھیں۔ سیکورٹی فورسز کا رویہ بھی اخوان کے ساتھ جانب دارانہ تھا۔ لہٰذا ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہمارا یہ تجربہ مفید رہا یا غیر مفید۔ ہم اس مختصر مدت میں کچھ نہیں کر سکے۔ کچھ منصوبے شروع ضرور کیے مگر ان کے پایہ تکمیل تک پہنچنے سے پہلے ہی میڈرڈ کانفرنس کی وجہ سے ہم نے اقتدار چھوڑ دیا اور یہ منصوبے ادھورے رہ گئے"۔

رکن پارلیمنٹ اور مخلوط حکومت میں تحریک اسلامی کی طرف سے بننے والے سابق وزیر سماجی بہبود یوسف العظم نے کہا: "ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت وزارتوں میں ہمارے احکام پر عمل نہیں ہوتا تھا اور متعلقہ افسران کو خفیہ ہدایات دی گئی تھیں کہ وہ ہمارے احکام پر عمل نہ کریں۔ کیونکہ عمل درآمد کی صورت میں عوام میں ہماری مقبولیت بڑھنے کا اندیشہ تھا"۔

ڈاکٹر عبداللہ جن کے پاس وزارت تعلیم و تربیت کا قلمدان تھا، کہتے ہیں: "تحریک اسلامی نے اس مختصر دور حکومت میں بہت کچھ سیکھا ہے۔ ہم نئے تجربات سے روشناس ہوئے ہیں۔ ہمیں ٹھوس حقائق کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ہمیں اپنی کارکردگی اور اپنی صلاحیتوں کا اندازہ ہوا ہے۔ ہم اپنے اعتدال پسند مخالفین کو یہ حقیقت باور کرانے میں کامیاب ہوئے ہیں کہ ہم دوسروں کی رائے کا احترام کرتے ہیں، دوسروں کے ساتھ

مل کر کام کرنے اور مذاکرات و مکالمے کے حامی ہیں۔ یوں ہم اپنے اور اپنے مخالفین کے مابین موجود نفسیاتی رکاوٹ دور کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں"۔

گذشتہ چند ماہ سے اردن میں اس موضوع پر بحث و مباحثہ ہو رہا ہے کہ کیا حکومت میں شمولیت روا ہے یا ناروا؟ تین نقطہ ہاے نظر سامنے آئے ہیں۔ ۱۔ ہر قسم کے حالات میں حکومت میں شامل ہونا چاہیے۔ حکومت میں عدم شمولیت عوام سے اور سیاسی عمل سے کنارہ کشی ہے۔ ۲۔ دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ حکومت میں ہرگز شامل نہ ہونا چاہیے بلکہ شرعی لحاظ سے ایسا نہ کرنا ہی بہتر ہے۔ ۳۔ تیسرا اور زیادہ قوی مسلک یہ ہے کہ درپیش حالات کو دیکھ کر شرکت کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کرنا چاہیے۔

چنانچہ تحریک اسلامی کی مجلس شوریٰ نے یہ فیصلہ کیا کہ موجودہ حالات میں عدم شرکت زیادہ موزوں ہے۔ اخوان المسلمون کے لیڈر عبدالمجید الذنیبات نے کہا: "ہمارا نصب العین اسلام کو درست شکل میں پیش کرنا ہے اور اس کے اصولوں پر عمل ہے خواہ ہم اقتدار میں ہوں یا اقتدار سے باہر۔ اصولی طور پر تو ہم شرکت اقتدار کے قائل ہیں۔ مگر ہم کیسے شریک ہوں؟ مخلوط حکومت میں فریق ثانی کے لیے ہمارا موقف کیا ہو گا؟ یہ سب فیصلہ طلب امور ہوتے ہیں۔ اردنی حکومت ہمیں اقتدار میں شریک کرنا چاہتی ہے تاکہ ہم بھی اس کی کوتاہیوں اور بدعملیوں میں برابر کے شریک بنیں۔

یہی بات محاذ عمل اسلامی کے جنرل سیکرٹری ڈاکٹر اسحاق فرحان نے کہی: "وہ کہتے ہیں کہ ایک سیاسی پارٹی کا فرض ہے کہ وہ انتظامیہ' عدلیہ' مقننہ اور ذرائع ابلاغ کے شعبوں میں شرکت کرے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتی تو پھر وہ وعظ و تبلیغ کرنے والی کوئی تنظیم ہے۔ اسے سیاسی پارٹی نہیں کہا جا سکتا۔ تاہم دیکھنا یہ ہے کہ کن حالات میں ایک اسلامی پارٹی شریک حکومت ہو"۔

اردن کے کئی قابل ذکر علما کرام نے موجودہ برسر اقتدار گروہ کے ساتھ مخلوط حکومت میں شامل ہونے کو شرعی لحاظ سے حرام قرار دیا ہے۔ وہ اسے گناہ کی حمایت و تائید سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس لیے کہ موجودہ حکمران ٹولے کے یہودیوں کے ساتھ قریبی تعلقات ہیں۔

المراقب العام عبدالمجید الذنیبات پچھلے دنوں امریکہ کے دورے پر تشریف لائے اور مختلف امریکی سیاسی شخصیتوں سے ملاقات کی' متعدد سیاسی بحث و تحقیقات کے مراکز کا دورہ کیا۔ المجتمع نے ان سے اس موقع پر انٹرویو لیا۔ ذیل میں اس انٹرویو کی خاص خاص باتیں دی جاتی ہیں۔

۱۔ پارلیمانی عمل' تحریک اسلامی کے لیے ایک سیاسی نوعیت کا عمل ہے۔ اس سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا موقع ملتا ہے۔ غیر اسلامی قوانین کے خلاف لب کشائی کرنے اور اسلامی امت اور اپنے وطن کے مفاد کی حمایت و تائید کرنے کا موقع ملتا ہے۔ امت کے مسائل کو قریب سے جاننے کا وقت ملتا ہے۔ ہمارے

لیے اپنے معاشرے کے دکھوں میں شرکت اور ان کا مداوا کرنے کے لیے پارلیمانی سیاست میں حصہ لینا ہمارے لیے ناگزیر ہے۔

۲- اقتدار میں شرکت کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں خود اخوان المسلمون کے اندر کئی نقطہ ہائے نظر ہیں اور ہر صاحب علم کو دلائل کی بنا پر ایک موقف اختیار کرنے کا حق ہے مگر ہماری غالب اکثریت کی رائے میں اس وقت عدم شرکت ہی مناسب ہے۔ جماعت میں کثرت آرا سے کچھ فرق نہیں پڑتا بشرطیکہ سب ارکان جماعت' جماعت کے اجتماعی موقف پر قائم رہیں۔

۳- ہم ایک طرف تو دعوت و ارشاد کے ذریعے امت کو تیار کر رہے ہیں۔ دوسری طرف اپنے کارکنوں کو اقتدار سنبھالنے اور نظم و نسق حکومت چلانے کے لیے بھی تیار کر رہے ہیں تاکہ ہم اسلامی اصولوں پر عمل کر سکیں۔

۴- اس سوال کے جواب میں کہ سیاسی عمل کے لیے خاص صلاحیتوں کے حامل افراد کی ضرورت ہوتی ہے اور آپ کی جماعت میں زیادہ تر دعوت و تبلیغ سے وابستہ حضرات اور ائمہ و خطبا کی اکثریت ہے' محترم عبدالمجید نے کہا:

"دعوت و سیاست کے عمل میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ البتہ خلوص نیت اور محنت کی سخت ضرورت ہے۔ ہمارے نقطہ نظر میں سیاسی عمل شرعی اور اخلاقی بنیادوں پر استوار ہونا ضروری ہے۔ ہماری جماعت میں سیاسی عمل اور دعوت و تبلیغ دونوں کا کام کرنے کی صلاحیتوں سے بہرہ ور افراد کی کمی نہیں"۔

۵- ہم نے دیگر ممالک کی اسلامی تحریکوں سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ ان کی کامیابی کے راز اور ان کی ناکامی کے اسباب بھی ہمارے سامنے ہیں۔ بلکہ ہم نے تو غیر اسلامی جماعتوں کے ڈھانچے کا بھی بنظر غائر مطالعہ کیا ہے۔ جب بھی اردن میں اسلامی نظام کے نفاذ کے مواقع ہمیں ملے تو ہم اپنے معاشرے اور اپنے حالات کے مطابق اسلامی اصولوں پر عمل کریں گے اور دنیا میں جہاں کہیں بھی اسلامی نظام پر عمل ہوا ہے' ان تجربات کو مدنظر رکھیں گے۔

یمن

سابقہ شمالی یمن میں اسلامیوں نے اقتدار میں کبھی شرکت نہیں کی۔ حکومت میں ان کی شمولیت ۱۹۹۳ اور ۱۹۹۷ کے مابین ہوئی ہے۔ ۱۹۹۳ سے پہلے اقتدار میں اسلامیوں کی شرکت کے بارے میں گفتگو کا تعلق شمالی یمن سے ہے جو جمہوریہ عربیہ یمن کہلاتا تھا۔ دوسرا حصہ جو ڈیمو کریٹک یمن سے موسوم تھا' اس میں سوشلسٹ نظام رائج تھا۔

اسلامیوں کی شرکت اقتدار کا آغاز ساٹھ کے عشرے سے ہوتا ہے جب امامی نظام کے خلاف انقلاب

کامیاب ہوا تھا۔ اس وقت یمن میں تحریک اسلامی اپنی ابتدائی حالت میں تھی۔ تاہم اس تحریک کے نوجوان اپنے اسلامی منصوبے کے لیے یمن کی ایک بھاری بھرکم شخصیت کی حمایت و تائید حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ یہ تاریخی اور سیاسی شخصیت تھی پروفیسر محمد محمود الزبیری۔ ان کے پرچم تلے اسلامیوں نے انقلاب کے بعد کی صورت حال کو اسلامی ڈھانچے میں ڈھالا۔ حالانکہ نیشنلسٹ اور مارکسی پارٹیوں کی کوشش تھی کہ وہ انقلاب کو دین مخالف رنگ میں رنگ دیں۔ تاہم فیلڈ مارشل عبداللہ السلال کے دور حکومت میں اسلام پسند، معروف سیاسی معنوں میں اقتدار میں شامل نہیں تھے۔ قاضی عبدالرحمٰن الاریانی کے عہد حکومت میں یہ سرکاری سیاسی مشینری کا بہت مختصر حصہ بنے۔ یہ وزارت تربیت و تعلیم کے مراکز تک محدود رہے۔ البتہ انھوں نے ملک میں نیا نصاب تعلیم مرتب کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ساٹھ کے عشرے میں یمن میں دیگر عرب ممالک اور خاص طور پر مصر کا نصاب تعلیم منتخب کر کے پڑھایا جاتا تھا۔ "دائمی دستور" بنوانے میں انھوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ یہ دستور سیکولر پارٹیوں کی طرف سے کی جانے والی کسی بھی آئینی خلاف ورزیوں یا ترامیم کے مقابلے میں ایک آڑ اور ڈھال ثابت ہوا۔

سابق صدر ابراہیم الحمیدی کے دور حکومت میں بھی اسلامیوں کی شرکت اقتدار جاری رہی۔ اس دور میں وہ قومی سطح پر دینی ادارے اور دفاتر دعوت و ارشاد قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے جس نے متوسط اور زیر تعلیم طبقات میں صحیح اسلامی بیداری پھیلانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ صدر علی عبداللہ صالح کے عہد حکومت میں شرکت اقتدار نے ایک نیا رخ اختیار کیا۔ ان کے دور صدارت کی ابتدا میں ہی حکومت اور حامیان اسلام کے مابین ایک عسکری معاہدہ ہوا تاکہ بڑھتی ہوئی اشتراکی لہر کا قلع قمع کیا جا سکے۔ اسلامیوں کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی اور وہ ملک کی سب سے بڑی قوت بن گئے۔

ادھر سوشلسٹ یمنی پارٹی اور نیشنل کانگریس کے مابین ایک کثیرالمقاصد سمجھوتہ ہوا جن میں سرفہرست اسلامی لہر کو دبانا تھا مگر اسلامیوں نے بروقت اقدام کرتے ہوئے یمنی معاشرے کی موثر قوتوں کے ساتھ اتحاد کر لیا اور التجمع الیمنی للاصلاح کے نام سے ایک پارٹی تشکیل دے لی۔ ۱۹۹۳ کے انتخابات میں اسلامیوں کو نمایاں پوزیشن ملی اور وہ سوشلسٹ پارٹی پر سبقت لے گئے۔ ۱۹۹۳ کے موسم گرما میں پہلی بار انھوں نے اقتدار میں علانیہ شرکت کی۔ اس سے پہلے وہ ۳۰ سال تک اپنے ارکان، معاونین اور ہمدردوں کے ذریعے شخصی طور پر شامل رہے تھے۔ اب کی بار شرکت حکومت کے دو حصے ہیں، پہلے حصے میں تین پارٹیوں پر مشتمل مخلوط حکومت تھی مگر بعد میں سوشلسٹ پارٹی اس اتحاد سے نکل گئی اور اپوزیشن کے بنچوں پر جا بیٹھی۔ دوسرے حصے میں دو جماعتی مخلوط حکومت بنی۔ کچھ اسلامیوں کے ساتھ نیشنل کانگریس پارٹی تھی۔ یہ صورت حال گذشتہ عام انتخابات تک جاری رہی۔ ان انتخابات میں کانگریس کو بھاری اکثریت

ملی اور اس نے تنہا اپنی حکومت بنائی۔

یمن میں اسلامیوں کے حکومت میں شامل ہونے کے فوائد یہ ہیں:

۱۔ انھوں نے ایک جمہوری عمل میں باقاعدہ حصہ لیا۔ اپنے رائے دہندگان کا احترام کیا۔ یوں اسلام مخالف قوتوں کے اس پراپیگنڈے کو غلط ثابت کر دیا کہ اسلام پسند جمہوریت پر یقین نہیں رکھتے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ وہ اپنی شرائط کے مطابق اقتدار میں موثر کردار ادا نہیں کر سکتے تو انھوں نے اقتدار کو خیرباد کہا اور اپوزیشن میں چلے گئے۔

۲۔ ۱۹۹۳ اور ۱۹۹۷ کے مابین بہت سی دستوری ترامیم کروائیں۔

۳۔ متحدہ یمن کے قیام کے لیے بھرپور کام کیا اور سوشلسٹوں کے خلاف لڑائی میں حصہ لیا۔

۴۔ بہت سے اہم قوانین پارلیمنٹ سے منظور کروائے، مثلاً اسلامی بنکوں کا قانون۔

۵۔ اس تجربے سے انھیں بہت سی ایسی باتیں معلوم ہوئیں جن سے وہ بے خبر تھے۔

لیکن نقصانات بھی ہوئے

سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ اسلامیوں کی مخالفت و عداوت میں اضافہ ہوا۔ مخالف قوتوں نے ان پر تنقید کی مگر ان کے ساتھ مخلوط حکومت میں شریک فریق ثانی پر تنقید سے صرف نظر کیا۔ ایک نقصان یہ بھی ہوا کہ شرکت اقتدار کا یہ مرحلہ یمنی تاریخ کے مشکل ترین اقتصادی حالات میں آیا۔ مجبوراً حکومت کو سخت اقتصادی پالیسیاں نافذ کرنا پڑیں۔ حامیان اسلام بھی چونکہ اقتدار میں شامل تھے، اس لیے ان کو بھی عوامی غیض و غضب اور نفرت و تنقید کا نشانہ بننا پڑا۔

ایک نقصان یہ بھی ہوا کہ حکومت میں شامل ہونے کے باوجود وہ اپنے تمام اہداف و مقاصد پر عمل نہ کر سکے۔ وہ مخلوط حکومت میں کمزور فریق ثابت ہوئے۔ تاہم ناسازگار حالات کے باوجود اسلامیوں نے وزارتوں کو عمدہ طریقے سے چلایا اور مشکل ترین حالات میں بھی ایسے کارنامے سرانجام دیے اور ایسی کامیابیاں حاصل کیں کہ ان کے وزرا اپنی اچھی کارکردگی کی وجہ سے، معاشرے میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

اہل دانش کی غالب اکثریت کی رائے میں شرکت اقتدار کا تجربہ نہایت مفید رہا ہے۔ اور اس کے مثبت پہلو منفی پہلوؤں سے زیادہ ہیں۔ گذشتہ عام انتخابات کے بعد اسلامیوں کے طرز عمل کو تمام قومی حلقوں نے بنظر تحسین دیکھا ہے۔ جب ان کی مجلس شوریٰ نے اعلان کیا: "نیشنل کانگرس پارٹی الیکشن میں بڑے پیمانے پر دھاندلی کے ذریعے بھاری اکثریت سے جیت چکی ہے لہٰذا اب وہی تنہا حکومت بنائے گی۔ حکومت نے ہمیں ان بے شمار سیٹوں سے محروم کیا ہے جن پہ ہمارے امیدوار کامیاب ہو چکے تھے۔ ہم اس دھاندلی اور

حکومت کی مخالفانہ پالیسی پہ احتجاج کرتے ہوئے اب اس کے ساتھ حکومت میں شریک نہیں ہوں گے اور پرامن و فعال اپوزیشن کا رول ادا کریں گے۔ یہ طرز عمل' اس قسم کے مواقع پر سوشلسٹوں کے وطیرے کے برعکس ہے۔ وہ لوگ ان مواقع پر خانہ جنگی شروع کرنے سے بھی باز نہیں آتے۔

پانچ اہم مسلم ممالک میں تحریکات اسلامی کے تجربات کے جائزے سے یہ مشترک نکات سامنے آتے ہیں:

☆ ان تمام پارٹیوں نے اپنے پلیٹ فارم سے انتخابات میں حصہ لیا اور کامیابی حاصل کرنے کے بعد تشکیل حکومت کے لیے دوسری پارٹیوں سے اشتراک عمل کیا۔

☆ الجزائر کے علاوہ کہ جہاں ابھی تک بحرانی کیفیت ہے اور حکومت اسلامی فرنٹ کے مقابلے میں مضبوط ہونے کے لیے دوسری اسلامی تحریکوں سے اشتراک اقتدار پہ مجبور ہے' باقی ہر جگہ شرکت اقتدار کا تجربہ ناکام ہوا۔

☆ شرکت اقتدار کا تجربہ صرف ترکی میں کامیاب ہوا کیونکہ وہاں اصل اقتدار رفاہ پارٹی کے ہاتھ میں تھا۔ دوسری پارٹیوں نے اس کے ساتھ اشتراک کیا تھا۔

☆ تقریباً ہر جگہ اسلامی تحریکوں کے وزرا کو حکومت سے یہ یکساں شکایت رہی کہ حکومت انھیں آزادی عمل اور اختیارات نہیں دے رہی۔

☆ تقریباً ہر ملک میں شرکت اقتدار کرنے والے اسلامی وزرا کا تبصرہ یہ ہے کہ حکومت میں شامل ہو کر کچھ فوائد بھی ہیں لیکن حکومت کی کارستانیوں کی بدنامی ہمارے کھاتے میں بھی آتی ہے۔

☆ شرکت اقتدار کرنے یا نہ کرنے کا انحصار حالات پر ہے۔ ایک ہی ملک میں دونوں فیصلے بھی کیے جا سکتے ہیں۔ (اخذ و تلخیص: المجتمع' شمارہ ۱۲۵۸' ۱۵-۲۱ جولائی ۹۷)

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں :

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو ایسے ہی کام کرنے کا حکم دیتے تھے جسے وہ کر سکتے' جو ان کے بس میں ہوتا"۔ (بخاری)

اخبار امت

یوگنڈا : افریقہ کا موتی

حافظ محمد ادریس

مشرقی افریقہ کا خشکی میں گھرا ہوا ملک یوگنڈا غیر مسلم اکثریت اور غیر مسلم حکمران کے باوجود او آئی سی کا ممبر ہے۔ اس کی یہ ممبرشپ سابق فوجی حکمران عدی امین کے دور حکومت کی مرہون منت ہے۔ عدی امین نے ۱۹۷۱ میں فوجی انقلاب کے ذریعے صدر ملٹن اوبوٹے کا تختہ الٹ کر حکومت پر قبضہ کر لیا تھا۔ ایک مسلمان سربراہ حکومت کی حیثیت سے انھوں نے او آئی سی کی رکنیت حاصل کی۔ عدی امین کی حکومت طویل خانہ جنگی اور تنزانیہ کی سرکاری فوجوں کی جانب سے امین مخالف قوتوں کی مسلح امداد کے نتیجے میں آخرکار ۱۱راپریل ۱۹۷۹ کو ختم ہو گئی۔ اس کے بعد سے آج تک ملک پر عیسائیوں کی حکومت ہے جو اپنی مصلحتوں کی وجہ سے مسلم ممالک کی تنظیم میں شامل رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس تنظیم نے دنیا بھر میں جو چار عالمی یونی ورسٹیاں قائم کی ہیں ان میں سے ایک یوگنڈا کے سرحدی شہر مبالے میں ہے۔ دیگر تین یونی ورسٹیاں پاکستان' ملائشیا اور نائیجر میں قائم کی گئی ہیں۔

یوگنڈا ایک غریب ملک ہے جو پٹرول اور اس کی جملہ مصنوعات سو فی صد بیرون ملک سے منگواتا ہے۔ پھر کوئی بندرگاہ نہ ہونے کی وجہ سے یہ درآمدات کینیا یا تنزانیہ کے راستے ملک میں پہنچتی ہیں۔ ملک کی آبادی دو کروڑ بیس لاکھ کے قریب ہے اور رقبہ ۹۳۰۷۰ مربع میل ہے۔ پورا ملک زرخیز ہے مگر زراعت کو جدید انداز میں منظم نہیں کیا گیا۔

یوگنڈا نے برطانوی استعمار سے ۹راکتوبر ۱۹۶۲ کو آزادی حاصل کی۔ دولت مشترکہ اور افریقی ممالک کی تنظیم کا بھی رکن ہے۔ اس ملک کو حسین مناظر کی وجہ سے افریقہ کا موتی (Pearl of Africa) بھی کہا جاتا ہے۔ دریائے نیل کا منبع بھی یوگنڈا میں ہے۔ یوگنڈا میں جنجا شہر کے پاس بہت بڑا پن بجلی کا کارخانہ ہے جس سے یوگنڈا بڑی مقدار میں بجلی پیدا کرتا ہے اور کینیا کو برآمد کرتا ہے۔

آزادی کے بعد یوگنڈا نے بہت سی قبائلی لڑائیوں اور بار بار کی خانہ جنگیوں کے کافی چرکے کھائے ہیں۔ یوگنڈا کا موجودہ حکمران ۵۳ سالہ صدر یوویری کاگوتا موسیوینی (Yoweri Kaguta Museveni) طویل جنگ کے بعد سرکاری فوجوں کو شکست دے کر ۲۹ جنوری ۱۹۸۶ کو دارالحکومت کمپالا پر قابض ہوا اور آج تک تقریباً بلاشرکت غیرے اس ملک پر حکومت کر رہا ہے۔ بعد میں اس نے انتخابات کا ڈھونگ رچایا اور دو مرتبہ صدر منتخب ہو کر جمہوری طرز حکومت کا تاثر قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ صدر موسیوینی کے متعلق یوگنڈا میں یہ بات زبان زدعام ہے کہ وہ یوگنڈا کا قانونی اور جائز شہری نہیں بلکہ اس کا تعلق پڑوسی ملک روانڈا سے ہے، مگر جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے مصداق کوئی اس کے خلاف دم نہیں مار سکتا۔ صدر کا تعلق توتسی (Tutsi) قبیلے سے ہے جو روانڈا، برونڈی، زائر اور دیگر علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ قبیلہ چھوٹا ہے مگر جنگجو اور مہم جو کی حیثیت سے معروف ہے۔

گذشتہ چند سالوں سے اس خطے میں مختلف ممالک میں خانہ جنگی، قتل عام، ہجرت اور حکومت کے تختے الٹنے کا عمل جاری ہے۔ ہوتو (Hutu) اکثریت کے ممالک میں توتسی قبیلے کی کامیابیاں زیادہ تر صدر موسیوینی کی جنگی کارروائیوں کی مرہون منت ہیں۔ روانڈا اور برونڈی میں عدم استحکام اور اکھاڑ پچھاڑ کے بعد مغربی طاقتوں کی پشت پناہی سے موسیوینی نے زائر اور سوڈان میں بھی اپنی مرضی کے مطابق تبدیلیاں لانے کا عزم کیا اور عملاً جنگ میں کود پڑا۔ زائر کے سابق صدر موبوتو کے بارے میں یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ دنیا کے بدعنوان، بدمعاش، عیاش، ظالم ترین حکمرانوں میں سے ایک تھا۔ اس کے خلاف ملک میں شدید نفرت تھی مگر آمریت کا شکنجہ اس قدر مضبوط تھا کہ اس آمر کے دور حکومت میں طویل عرصے (نومبر ۱۹۶۵ سے مئی ۱۹۹۷ تک) کوئی اسے توڑ نہ سکا۔ مغربی طاقتوں نے جب اس کرپٹ حکمران کو ہٹانے کا فیصلہ کر لیا تو خانہ جنگی شروع ہو گئی اور صدر موسیوینی اور اس کی فوجوں کی حمایت سے باغی گروہ کافی خون ریزی کے بعد مئی ۱۹۹۷ میں حکومت کا تختہ الٹنے میں کامیاب ہو گیا۔ موبوتو یورپ میں باقی ماندہ زندگی عیش و عشرت میں گزارے گا اور زائر جو انقلاب کے بعد جمہوریہ کانگو بن گیا ہے کبیلا (Kabila) کے زیر حکومت اور موسیوینی کے زیر بار احسان نئے دور میں داخل ہو گیا ہے۔ یہ بھی توتسی قبیلے کی فتح قرار دی جا رہی ہے۔

موسیوینی اچھا منتظم ہے۔ وہ مسلمانوں کا دشمن اور اندر سے اسلام کا شدید مخالف ہے۔ یوگنڈا کے مغربی علاقوں میں اگرچہ آج بھی ایک باغی گروپ "الائیڈ ڈیمو کریٹک فورسز" کے نام سے حکومت مخالف سرگرمیوں میں مصروف عمل ہے مگر مجموعی طور پر ملک میں امن و امان کی حالت خاصی بہتر ہے، البتہ مہنگائی بہت زیادہ ہے۔

سوڈان میں جب سے اسلامی قوانین کے نفاذ کا کام شروع ہوا ہے، امریکہ اور اس کی رہنمائی میں سوڈان

کے تمام ہمسایوں نے اس کے خلاف جنگ چھیڑ دی ہے۔ بعض نے باقاعدہ اعلان جنگ کیا ہے اور بعض بغیر اعلان اس لڑائی میں عملاً شریک ہیں۔ موسیونی کی سوڈان دشمنی اور علیحدگی پسندوں کی سرپرستی کی وجہ سے امریکہ بھی یوگنڈا کا سرپرست بن گیا ہے۔ موسیونی کو ایک اصول پسند، جمہوری، بہادر اور دیانت دار لیڈر کے طور پر دنیا میں متعارف کرایا جا رہا ہے۔ ٹائم میگزین اور دیگر مغربی جرائد و رسائل کے صفحہ اول پر اس کی تصاویر چھپتی رہی ہیں۔ موسیونی کس قدر جمہوریت پسند اور دیانت دار ہے اس کا پتا یوگنڈا جا کر چلتا ہے جہاں لوگ اس کے بارے میں حقائق جانتے بھی ہیں اور مختلف انداز میں بیان بھی کرتے ہیں۔

ایتھوپیا، اریٹیریا، مصر اور یوگنڈا نے سوڈان پر حملے کرنے اور اسے مزا چکھانے کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ بعض دیگر مسلمان ممالک کا اسلحہ "اس کار خیر" میں استعمال ہو رہا ہے۔ ماہ مئی میں یوگنڈا نے سوڈان کے ساتھ ایک عارضی سمجھوتہ کیا تھا جو کینیا کے صدر مقام نیروبی میں صدر کینیا ڈانیال ارپ موئی کی موجودگی میں طے پایا۔ اس سمجھوتے کے کئی اسباب بتائے جاتے ہیں۔

یوگنڈا کے گذشتہ صدارتی انتخابات میں تین امیدواروں میں سے ایک مسلمان تھا جو آج بھی یوگنڈا میں حریت و جرات کا مظہر سمجھا جاتا ہے۔ یہ مسلمان میکریرے یونی ورسٹی کے شعبہ منصوبہ بندی کا چیئرمین محمد میانجا (Myanja) ہے جو نوجوان، اعلیٰ تعلیم یافتہ، مدبر اور مستقل مزاج ہے۔ اگرچہ وہ زیادہ ووٹ حاصل نہ کر سکا مگر اس نے یوگنڈا کے مسلمانوں کو بیدار کر دیا۔ یوگنڈا میں مسلمان تقریباً ایک تہائی ہیں مگر مغربی ذرائع انھیں سولہ فی صد سے زیادہ تسلیم نہیں کرتے۔ اس انتخاب کے نتیجے میں مسلمانوں کی ایک منظم جماعت وجود میں آگئی ہے جو مسلم امہ کے مسائل پر اپنا مضبوط موقف رکھتی ہے اور مجموعی طور پر ہر مظلوم طبقے کی حمایت و پشتیبانی اپنا فرض اولین سمجھتی ہے۔

صدر موسیونی ایک گھاگ سیاست دان اور ہم جو لڑاکا لیڈر ہے۔ اسے اس بات کا بخوبی احساس ہے کہ مسلمان اس کی بہت سی پالیسیوں سے نالاں ہیں۔ میکریرے یونی ورسٹی کے طلبہ اور خصوصاً وہاں کی جامع مسجد کا خطیب و امام، محمد کالبوزی اس کی پالیسیوں پر کھل کر تنقید کرتے ہیں جو اخبارات میں چھپ بھی جاتی ہے۔ محمد میانجا بھی جہاں کہیں جاتا ہے عوام کے ہجوم اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ صدر موسیونی نے پچھلے دنوں مسلم اکابر کا ایک اجلاس بلایا جس میں اس کے اپنے چیدہ لوگ مدعو تھے۔ اس نے اپنی پالیسیوں کے بارے میں اس اجتماع سے حمایت حاصل کرنا چاہی مگر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب ان لوگوں نے یوگنڈا کی جانب سے سوڈان پر حملے کی مخالفت اور مذمت کی اور اس عزم کا اعلان کیا کہ وہ یوگنڈا کی فوجوں کی سوڈان میں کارروائیوں پر اس خاموشی کا مظاہرہ نہیں کریں گے جس کا زائر کے معاملے میں مجموعی طور پر یوگنڈن قوم نے کیا ہے۔ موسیونی مسلم کمیونٹی کو ناراض بھی نہیں کر سکتا اور موجودہ حالات میں انھیں کچل

بھی نہیں سکتا۔ سمجھوتے کی ایک وجہ تو یہی تھی۔

سمجھوتے کی دوسری وجہ یہ بنی کہ یوگنڈا کی فوج جنوبی سوڈان میں شروع میں پیش قدمی کر رہی تھی مگر کچھ آگے بڑھ کر انھیں احساس ہوا کہ وہ گھیرے میں آ گئے ہیں۔ انھوں نے راہ فرار اختیار کی مگران کے چار سو فوجی، دو درجن ٹینک اور بہت سی فوجی گاڑیاں سوڈانی فوج اور مجاہدین کے قبضے میں آ گئے۔ یہ ایک زبردست ہزیمت تھی اور موسیوینی زائر کی فتح کا جشن منانے کے دوران اس ہزیمت کے زخموں کو چاٹنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے جنگ بندی کی خواہش کا اظہار کیا، سوڈان پہلے ہی یہ چاہتا تھا لہٰذا اس نے اس خواہش کا مثبت جواب دیا۔

تیسری اور بظاہر کم اہم وجہ خود کینیا کا اس معاملے میں تشویش میں مبتلا ہونا تھا۔ کینیا بذات خود اس جنگ میں سوڈان کے خلاف عملاً شریک نہیں مگر اس کی سرزمین مکمل طور پر اس "صلیبی معرکے" میں استعمال ہو رہی ہے۔ یہ سارا عمل امریکہ کے دباؤ کے تحت ہو رہا ہے اور کینیا چاہتا ہے کہ سوڈان اس کے بارے میں نرم گوشہ رکھے۔ اس نرم گوشے کی خاطر صدر موئی کی خواہش تھی کہ یہ سمجھوتہ اس کی وساطت سے عمل پذیر ہو جائے۔ یہ بھی واضح رہے کہ پورے خطے میں حکومتوں کی اکھاڑ پچھاڑ کی وجہ سے کینیا کے لوگ، یہاں کے اخبارات اور میڈیا یوگنڈا سے خائف بھی ہیں اور اس کی توسیع پسندی کے خلاف اظہار نفرت بھی کرتے رہتے ہیں مگر یوگنڈا سے بگاڑنا نہیں چاہتے۔ اس لیے انھوں نے مڈل مین کا کردار ادا کر کے فریقین کی خیر سگالی حاصل کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

یوگنڈا کے مسلمان تعلیم یافتہ اور زیادہ تر تجارت پیشہ ہیں۔ محمد میانجا اور اس کے ساتھیوں کی صورت میں انھیں اچھے رہنما مل گئے ہیں۔ عدی امین کے دور میں اسلام کو دہشت و تشدد کی علامت سمجھا گیا تھا۔ ان نوجوانوں کے سامنے ایک بڑا چیلنج ہے اور وسیع امکانات! کٹھن امتحانات ہیں اور روشن مستقبل! انھوں نے اپنی تنظیم کو صحیح اسلامی خطوط پر مرتب کر لیا ہے۔ یہ ان کے کام کا آغاز ہے مگر اللہ کے فضل سے بہت اچھا آغاز ہے۔ آج اسلام ایک معقول اور انسانی اقدار کے علم بردار دین کے طور پر متعارف ہو رہا ہے جس میں دلیل اور افہام و تفہیم ہے، انسانی حقوق اور انسانی عظمت کی ترجمانی ہے، کسی پر ظلم نہ کرنے کا منشور اور کسی کا ظلم برداشت نہ کرنے کا اعلان ہے۔ تعلیم یافتہ لوگوں میں یہ دعوت پھیل رہی ہے اور اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد حوصلہ افزا ہے۔ کچھ بعید نہیں کہ مستقبل میں اس ملک میں عوام کی تائید سے اسلامی تبدیلی آ جائے جو دیرپا اور کامیاب ثابت ہو اور ماضی کے فوجی انقلاب اور ناکام تجربے کے داغ مٹا سکے۔

رسائل ومسائل

سود اور مجبوری کی حالت

گذشتہ دنوں ایک رسالہ پڑھنے کو ملا جس میں سود کی مذمت کے بارے میں حضورؐ کے ارشادات تھے۔ یہ ارشادات پڑھ کر مجھے بہت رنج ہوا۔ رنج اس لیے ہوا کہ میرے والد سودی کاروبار کرتے ہیں (انھوں نے رقم بنک میں جمع کروا رکھی ہے اور اس پر سود لیتے ہیں) لیکن میں انھیں کچھ بھی نہیں سکتا کیونکہ وہ مجھ سے بڑے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ میرے والد ہیں۔ میں ایک پرائیویٹ سکول میں پڑھتا ہوں۔ مجھ پر مہینہ بھر میں ۴۰۰ روپے خرچ ہوتے ہیں۔ آپ میری رہنمائی کریں کہ کیا میں اپنے والد کے پیسوں سے کھاؤں پیوں اور ان کے پیسوں سے پڑھوں یا نہیں؟ اور یہ کہ مجھ سے قیامت کے روز اس کے بارے میں پوچھا جائے گا کہ نہیں؟ اگر میرا کوئی ذریعہ روپے کمانے کا نہیں بنتا ہو تو میں کیا کروں؟

خوشی ہوئی کہ آپ نے اس نوعمری میں دین کا اچھا خاصا مطالعہ کیا ہے اور کر رہے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ علمی جذبے کے ساتھ عمل کو بھی اہمیت دیتے ہیں اور اسی سلسلے میں رزق حلال کے لیے فکرمند ہیں۔ اس عمر میں ایسا شعور اللہ تعالیٰ کی خصوصی دین ہے جو ہر کسی کو حاصل نہیں ہوتی۔ اس پر میں آپ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں اور آپ سے کہوں گا کہ آپ اس نعمت پر اللہ تعالیٰ کا خصوصی شکر ادا کریں تاکہ اللہ تعالیٰ آپ کے علم و عمل میں مزید برکت پیدا فرمائے اور جو شعور آپ کو ودیعت فرمایا ہے آپ کے ذریعے گھر والوں، والدین، بہن بھائیوں، اعزہ و اقارب اور اہل علاقہ کو بھی عطا ہو اور ملک میں اسلامی انقلاب کے لیے ایک فوج تیار ہو جائے جو لادینی نظاموں کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جائے اور سودی نظام معیشت کے بجائے اسلام کا بابرکت نظام معیشت قائم ہو جائے۔

جہاں تک آپ کے اس سوال کا تعلق ہے کہ "آپ کے والد صاحب بنک میں رقم رکھ کر سود لیتے ہیں اور گھر والوں کے کھانے اور آپ کی تعلیم و تربیت اور خوراک و لباس میں سودی رقم شامل ہے" تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: فَاتَّقُوا اللّٰہَ مَا اسْتَطَعْتُمْ "اللہ سے اپنی استطاعت کے مطابق تقویٰ اختیار کرو"۔ آپ اس وقت بچے ہیں، اپنی کفالت کے قابل نہیں ہیں۔ آپ مجبور ہیں کہ والد صاحب جو

آپ کو دیں وہ آپ استعمال میں لائیں۔ اسی طرح گھر کے دوسرے بے سہارا افراد کا یہی حال ہے۔ ایسی صورت میں آپ والد صاحب سے عرض کریں کہ وہ سودی منافع اپنے استعمال میں نہ لائیں بلکہ مضطر' فقرا اور مساکین کو دے دیں کہ یہ اس کا مصرف ہیں۔

سودی لین دین کا گناہ بے شک وہی ہے جو آپ نے تحریر کیا ہے لیکن جب ایک بیماری بڑے پیمانے پر پھیل جائے اور وبا کی شکل اختیار کر جائے تو اس وقت اگر کوئی عام آدمی اس بیماری میں مبتلا ہوتا ہے تو اسے اس قدر مورد الزام نہیں ٹھہرایا جاتا جس قدر عام حالات میں کوئی اپنے آپ کو عیش و عشرت کا دلدادہ بنا کر بزور بیماری کو دعوت دے اور پھر بیماری کو اپنے ذوق و شوق سے بڑھاتا چلا جائے۔ اس وقت غریب عوام کی اکثریت سودی نظام کی وبا کا اس طرح شکار ہے کہ وہی آدمی اس سے بچ سکتا ہے جو ایمان و عمل کے اسلحے سے لیس ہو اور اپنے پورے وسائل و ذرائع اور صلاحیت اس سے بچنے میں لگا دے۔ ایسی صورت میں عوام کو ملامت کرنے اور سب کو ملعون کرنے کی بجائے اس طبقے کو نشانہ بنایا جائے جو اس صورت حال کا ذمہ دار ہے۔ ارباب حکومت' بڑے کاروباری اور تجارت پیشہ سرمایہ دار' جاگیردار' وڈیرے' بیوروکریٹ اور حکومت بنانے اور ختم کرنے میں دخیل اور معاشی اتار چڑھاؤ کے ذمہ دار اصل مجرم ہیں اور جو احادیث آپ نے لکھی ہیں ان کا بھی اصل مصداق یہی لوگ ہیں۔ اگرچہ اپنے جرم کے مطابق ہر خاص و عام کا اس میں حصہ ہے۔ ایسی صورت میں آپ اپنی انفرادی کوششیں جاری رکھیں اور سودی نظام کے خلاف لوگوں کو جس قدر بھی منظم کر سکتے ہوں' کریں۔ ایک دو آدمیوں کو بھی روک دیں یا صرف اپنے والد صاحب محترم کو اس سے چھٹکارا دلا دیں تب بھی بہت بڑی بات ہے۔ دراصل سودی نظام کی مزاحمت کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ قانون نافذ کیا ہے کہ صرف سود لینے والا ہی مجرم نہیں بلکہ دینے والا بھی اس گناہ میں شریک ہے۔ دینے والا اگرچہ مظلوم ہے لیکن اسے اس گناہ میں اس لیے شریک کیا گیا ہے کہ ظلم اس وقت تک ختم نہیں ہو سکتا جب تک مظلوم ظلم کو برداشت کرنے اور قبول کرنے سے انکار نہ کر دے۔ اسلام مسلمانوں کے اندر یہ صفت پیدا کرنا چاہتا ہے۔ آج اگر یہ صفت زندہ ہو جائے' مسلمان فیصلہ کر لیں کہ وہ ظلم برداشت نہ کریں گے تو پھر کوئی حکمران' حکمران طبقے کا کوئی ادارہ یا گروہ انھیں ظلم کا نشانہ نہ بنا سکے گا۔ آج اگر تمام لوگ سود دینے سے انکار کر دیں تو بنک ان کا کیا بگاڑ سکیں گے' کون ان سے سود لے کر بنک کو دے گا۔ پولیس' فوج یا دوسرا کوئی گروہ کیا کر سکے گا جب کہ تمام عوام ظلم کے خلاف کھڑے ہو جائیں۔ ایسی صورت میں ظالم کو پسپا ہونا پڑے گا۔ سودی کاروبار کا قلع قمع اسی وقت ہو سکے گا جب ہم سب اس کے خلاف مزاحمت کریں گے۔ یہی حکم شراب اور دوسرے منکرات کا ہے۔

اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ عوام کو بیدار کیا جائے۔ لوگوں کو جس قدر بھی آپ سودی نظام کے جال سے نکالنے میں کامیاب ہو جائیں اسی قدر غنیمت ہے لیکن اس کے ساتھ آپ مایوس بھی نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت بڑی وسیع ہے۔ وہ بندوں کے دلوں کے حال کو جانتا ہے اور وہ جانتا ہے کہ کون کس قسم کے حالات میں' کس قسم کے جرم کا کس مقدار میں مرتکب ہے۔ اپنی نیت' اپنی حالت اور اپنے طرز عمل کے لحاظ سے ہر آدمی کا اس کے مطابق حساب و کتاب ہو گا۔ ان شاء اللہ آخرت میں ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ نہیں پکڑے گا جو سودی نظام کو برا سمجھتے تھے' اس سے نفرت کرتے تھے' اس کے خلاف دعوت و تبلیغ کرتے تھے اور اسے مٹانے کے لیے کوشاں تھے۔ اس جذبے کے ساتھ آپ اپنے قدم آگے بڑھائیں۔ پاکستان اور دنیا بھر میں طاغوتی نظاموں کے خاتمے کے خلاف جو تحریک برپا ہے اس کا ہراول دستہ بنیں۔ نوجوانوں کو اس میں شامل کریں۔ ان شاء اللہ وقت آئے گا کہ اسلامی تحریک ایک طوفان بن کر باطل نظاموں کو مٹا دے گی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو استقامت عطا فرمائے اور آپ کے لیے دین بندگی' اور رزق حلال کے راستے آسان کر دے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا (العنکبوت ۲۹: ۶۹)' "وہ لوگ جو ہماری رضا حاصل کرنے کے لیے جہاد کرتے ہیں' ہم انھیں اپنے راستے بتلا دیں گے"۔ ان شاء اللہ آپ کے لیے بھی اس جہاد کی بدولت جو آپ نے شروع کیا ہوا ہے' راستے کھلیں گے۔ اللہ کرے کہ ایسا ہو۔ آمین! (عبدالمالک)

وسوسوں کی حقیقت اور علاج

طرح طرح کے وسوسے آتے ہیں' خصوصاً نماز میں۔ ان کا کیا علاج کروں؟

وساوس کے سلسلے میں ایک بنیادی بات یہ ہے کہ یہ اکثر غیر اختیاری ہوتے ہیں' فطرت کا لازمہ ہیں' اور شیطان کو بس یہی وساوس پیدا کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔ جس طرح ایک راستے پر ہر قسم کی سواری چل سکتی ہے' اسی طرح دل کی راہ پر قسم قسم کے خیال کا گزر ہو سکتا ہے۔ انسان کو اپنے کام سے کام رکھنا چاہیے' راستہ چلتے رہنا چاہیے' صحیح منزل پر نگاہیں جمائے رکھنا چاہییں اور اس کی سمت میں چلنا چاہیے۔

مطلوب چلنا اور پہنچنا ہے نہ کہ کیفیت۔ غیر اختیاری چیزوں کی وجہ سے چلنے کی کیفیت میں اونچ نیچ سے بحث نہیں ہے' وہ تو ہو گی ہی۔

اگر وساوس کی جڑیں مذموم ہیں تو ان سے کنارہ کشی اختیار کرنا چاہیے' مثلاً دولت' حسن' جاہ---

اگرچہ پھر بھی مکمل چھٹکارا ممکن نہیں --- اگر مطلوب ہیں، جیسے کہ اللہ کے دین کا کام، تو اس کام سے کنارہ کشی تو ہرگز نہیں ہو سکتی۔

وساوس کا قانون یہ ہے کہ جتنا انسان ان کی فکر کرے اور ان کو کوشش سے نکالنے کی کوشش کرے اتنا ہی وہ راسخ ہو جاتے ہیں۔ یہ خیالات ہیں، ان کو نکالنے کے لیے خیال کو ان پر مرکوز کرنا پڑتا ہے۔ اس سے ان کو اور غذا ملتی ہے۔ اصل چیز یہ ہے کہ لاپرواہ بن کر اپنے کام میں لگے رہو۔ لاپرواہی اور عدم توجہ سے یہ خود کمزور پڑنا شروع ہو جاتے ہیں۔

نماز میں جو پڑھ رہے ہو اس پر دھیان رکھو، دل میں ترجمہ دہراتے جاؤ اور بار بار اپنے کو یاد دلاؤ کہ اللہ کے سامنے ہو، اس سے باتیں کر رہے ہو، شاید یہ آخری موقع ہو --- پھر بھی جو کچھ وسوسہ آ جائے، اس پر استغفار کرو اور اپنے کام سے کام رکھو۔ (خرم مراد، ۲۶ نومبر ۸۷)

کتاب نما

سید مودودیؒ : پرعزم زندگی' گم نام گوشے' محمد حسین شمیم۔ حرا پبلی کیشنز' اردو بازار' لاہور۔ صفحات: ۱۵۷۔ قیمت: ۴۸ روپے۔

مصنف کئی برس تک مرکز جماعت اسلامی پاکستان سے ٹائپ کار کی حیثیت سے وابستہ رہے۔ انھیں مولانا مودودیؒ کے خطوط اور دیگر مسودات ٹائپ کرنے کا موقع ملا۔ زیر نظر کتاب میں انھوں نے مولانا موصوف کے بارے میں سادہ و صاف مگر دل کش انداز و اسلوب میں اپنی یادداشتیں مرتب کی ہیں۔ معلومات اور مشاہدات کی یہ دلچسپ کہانی ایک ایسے شخص نے لکھی ہے جو مولانا کے بہت قریب رہا اور جسے ان کا اعتماد حاصل تھا۔

مولانا کی باذوق' نفیس اور دل نواز شخصیت کی متنوع جھلکیاں' ضبط نفس' انداز تالیف و تحریر' بظاہر معمولی اور چھوٹی چھوٹی باتوں میں احتیاط' دوسروں کی خیر خواہی اور خبر گیری' احترام آدمیت--- اور نجی زندگی کے پہلو: علاج معالجہ' گردے کی تکلیف' بچوں کے لیے فکر مندی--- گرفتاریاں' جیل کی زندگی' سزاے موت' جماعت کے اندرونی اختلافات اور ماچھی گوٹھ وغیرہ وغیرہ--- یہ مولانا کی باقاعدہ سوانح عمری نہیں' مگر اس سے ان کی پرعزم زندگی کے گم نام گوشے سامنے آتے ہیں' ایک داعی حق کی واضح اور خوب صورت تصویر---! مولانا مودودیؒ کی داستان حیات کے زیر نظر چند دل کش اوراق میں جماعت اسلامی اور پاکستان کی جزوی تاریخ بھی آ گئی ہے۔ مولانا کے دست نوشت خطوں کے عکس بھی شامل کتاب ہیں۔

شمیم صاحب کی یادداشتوں سے پاکستان کی تحریک اور قیام کی پس منظری داستان کی جھلکیاں بھی سامنے آتی ہیں اور جماعت اسلامی پر بعض علما کی الزام تراشیوں اور مخالفتوں (جو زیادہ تر مصلحتوں اور مفادات کے تابع تھیں' ص ۲۷) کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ مولانا مظہر علی اظہر نے خود تسلیم کیا کہ قائداعظمؒ کو "کافر اعظم" میں نے کہا تھا (نہ کہ کسی اور نے' ص ۴۱)۔

ضابطہ اشاعت میں وضاحت کرنا ضروری تھا کہ یہ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن ہے۔ کاغذی جلد' عمدہ چھپائی اور قیمت مناسب ہے۔ (رفیع الدین ہاشمی)

اشاریہ افکار مودودیؒ مرتبہ: انور عباسی۔ ناشر: بک پروموٹرز، مرکز ایف سیون، اسلام آباد۔ صفحات: ۳۷۵۔ قیمت: ۲۲۰ روپے۔

بیسویں صدی کی تاریخ اسلامی فکر و حرکت میں سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ ایک ممتاز اور نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ان کے گہربار قلم نے جدید ذہن میں پیدا شدہ اشکالات کو دور کر کے، قرآن و سنت اور اسلامی روایت کی روشنی میں جس حسن کلام اور حسن دلیل سے کام لیا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کا ایک عطیہ ہے۔ سیدی نے سیکڑوں موضوعات پر، ہزاروں صفحات لکھے اور کوئی بات محض لکھنے کے لیے نہیں لکھی، بلکہ ضرورت کے تحت اور مقصد کو ملحوظ رکھ کر پوری ذمہ داری سے لکھی مگر ان کی تحریروں کا کینوس اتنا وسیع اور متنوع ہے کہ کسی خاص موضوع یا مسئلے تک رسائی آسان نہیں ہے۔

تحقیق کاروں اور مطالعہ کرنے والوں کے لیے ایک ایسی کتاب کی ضرورت تھی، جس میں مولانا مودودیؒ کی تحریروں کا باریک بینی سے مطالعہ کر کے، ان کے موضوعات کا ایک جامع اشاریہ بنایا جاتا۔ کم و بیش ایک ہزار موضوعات (آخرت، ابوحنیفہ، اذان، جزیہ، تصوف، شہید، عبدالسلام نیازی، عقل، مجسمہ سازی، معراج، من و سلویٰ، نفسیات، وریا مندر سکیم، یورپ وغیرہ وغیرہ) کے بارے میں قاری جاننا چاہے کہ مولانا نے کس کس موضوع پر، کہاں کہاں، کس کس کتاب میں لکھا ہے تو یہ کتاب قاری کی دستگیری کرتی ہے۔

اشاریہ سازی کے لیے موضوع کا انتخاب یا تحریر میں بیان کردہ نکتے کو اخذ کرنا، جہاں تحریر کے مجرد روپ کی بنیاد پر ممکن ہوتا ہے، وہیں اس کا دارومدار، اشاریہ ساز کی صلاحیت اخذ و فہم اور ذہنی سطح پر بھی ہوتا ہے۔ "اشاریہ افکار مودودیؒ" مرتب کے ذوق، وجدان، معیار اور نظر انتخاب کا آئینہ دار ہے، اور تحقیق و مطالعہ کرنے والوں کے لیے ایک ہدیہ بھی۔ اس میں بعض پہلوؤں سے کمی محسوس ہو سکتی ہے، اور اس کا تعلق بھی ذوق نظر سے ہو سکتا ہے، لیکن اصل چیز تو کسی بڑے اور مشکل منصوبے پر کام کرنا ہے۔ قلمی جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے، انور عباسی نے نقش اول کے طور پر یہ اشاریہ مرتب کیا ہے۔ اب یہ اہل علم اور متلاشیان حق کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس سے استفادہ کریں اور مطالعے میں سہولت پائیں، بلکہ اگر کسی پہلو سے کوئی کمی محسوس کریں یا کوئی مشورہ دینا چاہیں، تو ناشر یا مرتب کو ضرور آگاہ کریں۔

بہرحال یہ کتاب، دینی علوم، احیاے اسلام اور مولانا مودودیؒ کی فکر تک رسائی کی خواہش رکھنے والوں کے لیے ایک بامعنی تحفہ ہے۔ جسے مولانا مودودیؒ کی چھوٹی بڑی تصانیف و مرتبہ کتب کی بنیاد پر تیار کیا گیا ہے۔ یہ اشاریہ، مولانا کی تصانیف کے موجودہ ایڈیشنوں پر مبنی ہے۔ اگر کسی آیندہ ایڈیشن میں کسی کتاب کے صفحات میں تبدیلی یا کمی بیشی ہوگی تو اس کتاب کے لیے، یہ اشاریہ کارآمد نہیں رہے گا--- اس اعتبار سے مولانا مودودیؒ کے ناشرین کو ان کی تصانیف کے معیاری اور مستند ایڈیشن تیار اور شائع کرنے چاہییں۔

(سلیم منصور خالد)

سخن دل نواز، مترجم: مولانا امیر الدین مہر۔ اہتمام: ورلڈ اسمبلی آف یوتھ، ریاض، سعودی عرب۔ صفحات: ۱۲۵۔ قیمت: درج نہیں۔

وامی (World Assembly of Youth) کے شعبہ تحقیق و تعلیم کی طرف سے مولفہ، عربی کتاب "فی اصول الحوار" کا موضوع، گفتگو کا فن ہے۔ دوسروں تک اپنی دعوت پہنچانے کے لیے یہ ایک اہم وسیلہ ہے اور اگر گفتگو کے آداب کا پوری طرح خیال رکھا جائے تو اس سے خاطر خواہ اور بہت عمدہ ثمرات و نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ قرآن حکیم، حدیث نبویؐ اور دینی اکابر کی تالیفات میں بکھرے ہوئے آداب گفتگو کو نہایت عمدگی اور سلیقے سے زیر نظر کتاب میں مرتب کر دیا گیا ہے۔ کتاب کے مختلف عنوانات اس کے موضوعات و مباحث کو بخوبی واضح کرتے ہیں، مثلاً گفتگو اور بے جا بحث میں فرق، قرآن اور گفتگو، رسولؐ اور گفتگو، نیت کا خالص ہونا، مناسب موقع کی تلاش، گفتگو میں خود کو ترجیح نہ دینا، غور سے سننا، بحث ختم کر دینا، متکلم کی ضمیر استعمال نہ کرنا وغیرہ۔

مولانا امیر الدین مہر (اسسٹنٹ پروفیسر، دعوہ اکیڈیمی بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد) نے اس مفید، کار آمد اور اپنے موضوع پر جامع کتاب کو نہایت سہل زبان میں اردو میں منتقل کیا ہے۔ اس کی افادیت کا اندازہ کرنے کے لیے ایک اقتباس دیکھیے:

"داعی کو خصوصاً اور ہر گفتگو کرنے والے کو چاہیے کہ وہ اپنی بات ہی نہ کہتا رہے کہ دوسرے کو بات کرنے کا موقع ہی نہ دے۔ دوران کلام وقت کا لحاظ رکھے۔ نیز جب وہ کسی کانفرنس میں ہو اور اسے چند منٹ دیے جائیں تو اس کی پابندی کرے اور اگر ایسی محفل ہو کہ جس میں تحدید وقت کا مسئلہ نہ ہو تو داعی اپنے موقف کے مطابق وقت کا تعین خود کرے"۔ مختصر یہ کہ کتاب دلچسپ ہے اور اس کی افادیت میں کلام نہیں۔ (ر-ہ)

The Islamic Nation (امت مسلمہ)، علی نواز میمن۔ ناشر: دین گارڈ بکس، ۴۵ دی مال، لاہور۔ صفحات: ۲۶۱۔ قیمت: درج نہیں۔

امریکی صدر جارج بش کے پیش کردہ نئے عالمی نظام (New World Order) کے نظریے نے دنیا بھر میں کھلبلی مچا دی ہے۔ اس موضوع پر متعدد مطبوعات سامنے آئی ہیں۔ علی نواز میمن نے اپنی زیر نظر کتاب میں ایک نئے انداز سے نیو ورلڈ آرڈر اور امت مسلمہ کے تعلق کار کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ کتاب کا ضمنی عنوان ہے: نئے عالمی نظام میں مسلمانوں کی حیثیت اور ان کا مستقبل۔

مصنف نے جو ربع صدی تک عالمی بنک کے لیے خدمات سرانجام دیتے رہے ہیں، اپنے جملہ تجربات

اور معلومات کو اس کتاب میں جمع کر دیا ہے۔ مسلم اقتصادیات، مسلم عمرانیات، مسلم افواج، مسلم حکومتیں، مسلم روحانیات، مسلم بلاد اور مسلم نشات ثانیہ جیسے مباحث کے ساتھ تفصیلی تائیدی گوشوارے بھی پیش کیے گئے ہیں۔ مصنف نے اعداد و شمار کے ذریعے بعض حقائق کی طرف متوجہ کیا ہے، مثلاً یہ کہ دنیا کی دس فی صد آبادی نے پچاس فی صد عالمی وسائل پر قبضہ کر رکھا ہے یا یہ کہ مسلم نوجوانوں کو مغرب میں بقائے مذہب کی جدوجہد کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے یا یہ کہ مغربی ممالک خصوصاً امریکہ اور مغربی یورپ کے حکمران اور دانش ور اسلامی خطرے سے بلاجواز خوفزدہ ہیں یا یہ کہ مشرق اور مغرب کے درمیان مکالمے کا آغاز ہونا چاہیے وغیرہ۔

بلاشبہ مصنف نے بڑی عرق ریزی اور محنت سے لوازمہ فراہم کیا ہے جو قابل داد ہے مگر یہ گزارش کرنا بھی ضروری ہے کہ موصوف نے بعض مسائل کو سطحی نظر سے دیکھا ہے۔ اسی لیے کئی معاملات پر ان کی رائے محل نظر ہے، مثلاً جمال عبدالناصر، ذوالفقار علی بھٹو اور معمر القذافی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ان کے اچھے برے ہونے کا فیصلہ اللہ ہی کر سکتا ہے (ص ۸۹)۔ بلاشبہ اللہ کے فیصلے اور گرفت سے کسی کو مفر نہیں ہے لیکن کسی شخص کے دنیاوی اعمال سے بھی تو اس کے نیک و بد ہونے کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

اسی طرح سود کے بارے میں یہ کہنا کم علمی ہے کہ: "سود کی ہر حال میں ممانعت نہیں ہے"۔ (ص ۸۷) اور یہ بات ایک بڑے فتنے کو ہوا دینے کے مترادف ہے۔ اسلامی حکومتوں کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے مصنف نے افراط و تفریط سے کام لیا ہے۔ ایران اور سعودی عرب کی حکومتیں اپنے تمام مظاہر میں سو فی صد اسلامی نہیں ہیں، نہ نائیجیریا اور سوڈان اور ملائیشیا کے تجربات حرف آخر ہیں اور نہ مصر کے حکمرانوں کا طرز عمل قابل تقلید ہے۔ جدید دور میں سائنٹیفک بنیادوں پر ریاست کی تشکیل میں ملائیشیا کا تفصیلی مطالعہ پیش کرنا مناسب تھا۔ اسی انداز میں انڈونیشیا کا تذکرہ بھی مفید رہتا۔ جہاں تک جنوبی ایشیا اور افریقہ کے انتہائی پس ماندہ، غریب اور قرضوں میں جکڑے ہوئے ممالک کے طرز عمل کا تعلق ہے ان کی مقامی فروگذاشتوں کے علاوہ ان غیر ملکی حکمرانوں کا بھی دخل ہے، خصوصاً امریکہ، برطانیہ، فرانس، جرمنی، ہالینڈ اور پرتگال جنھوں نے چھوٹے غریب ممالک کو اپنی نو آبادیات بنایا اور ان کے اثرات، آزادی کے بعد سو سال میں بھی زائل نہ ہو سکے۔ پاکستان کا معاملہ بھی اسی پس منظر میں زیر بحث لانا چاہیے تھا۔ حیرت ہے کہ فاضل مصنف نے نو آبادیاتی دور کے مضر اور دور رس اثرات کا کماحقہ تنقیدی جائزہ نہیں لیا۔ قادیانیوں اور بہائیوں کا ذکر مسلم فرقوں کے ضمن میں کیا گیا ہے حالانکہ ان دونوں گروہوں کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ آغا خانیوں کے بارے میں بھی مسلم امت کا فیصلہ سب کے سامنے ہے۔ چیچنیا کے اندر جاری جنگ آزادی کو، مغرب کی تقلید میں خانہ جنگی قرار دینا درست نہیں ہے۔

کتاب کے مباحث کی روشنی میں دو امور غور طلب ہیں: پہلی بات تو یہ ہے کہ اقتصادی خوشحالی، فوجی

بالادستی' اسلحے کے انبار' شرح خواندگی' بے روزگاری کا خاتمہ' صاف ستھری فضا' صحت' علاج' ملازمت اور تعلیم کے مواقع ایسے موضوعات مغرب کے عطا کردہ ہیں۔ بلاشبہ یہ امور بھی قابل توجہ ہیں مگر احیاے امت اور اسلام کی بالادستی کا خواب "کی محمدؐ سے وفا تو نے---" ہی سے پورا ہو سکتا ہے۔ اگر اس مرکزی نکتے پر زور نہ دیا گیا تو کہیں کی اینٹ' کہیں کا روڑا جمع کرنے سے امت کی نشات ثانیہ کا خواب حقیقت نہ بن سکے گا۔ کمیونزم' سرمایہ داری' جنسی طوفان اور مسخ شدہ عیسائیت کا اسلام دشمن کردار الگ الگ مظاہر (individual phenomenon) نہیں ہیں بلکہ ان سب کی جڑیں اللہ سے بغاوت میں پیوست ہیں۔ میمن صاحب نے ان مختلف مظاہر کو الگ الگ سمجھتے ہوئے مختلف معاملات پر جو جزوی بحثیں قائم کی ہیں ان کو کسی ایک نکتے تک محدود کیا جائے تو ماخذ کا پتا بھی چل سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بوسنیا اور جموں و کشمیر کے مظلومین پر گفتگو کرتے ہوئے وہ چند پیراگراف سے زیادہ نہ لکھ سکے۔ مغرب کی تشبیہ' استعارہ' حل مسائل اور نقد معاملات کو ہو بہو مسلم معاشروں پر منطبق کر دینا درست نہیں' اس سے مسائل الجھ جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی شدت پسند تحریکوں اور بھارت کی آر ایس ایس کا یکجا تذکرہ نظر آتا ہے حالانکہ امر واقعہ میں ایسا نہیں ہے۔

مصنف کی معلومات کا ماخذ عموماً اقوام متحدہ اور عالمی بنک کی ۱۹۹۴ تک شائع شدہ رپورٹیں ہیں۔ اسلامی بیداری کے لیے موصوف نے جو سفارشات مرتب کی ہیں وہ مطالعے کے قابل ہیں۔ بایں ہمہ بعض موضوعات پر مزید تفصیلی مطالعے کی ضرورت ہے۔ مصنف امت کے لیے خیر خواہانہ جذبات رکھتے ہیں۔ کتاب کا اختتام اس دعا پر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ امت کو صراط مستقیم پر گامزن کرے تاکہ وہ دنیا کی بہتر صورت گری میں معاون ہو سکے۔

طلبا' محققین اور سیاسیات و ابلاغ سے وابستہ افراد اپنے موضوع پر اسے ایک مفید اور معلومات افزا کتاب پائیں گے۔ بڑے اشاعت گھروں سے شائع ہونے والی کتابوں پر قیمت کا عدم اندراج افسوس ناک ہے۔ (محمد ایوب منیر)

قرآن : سب کے لیے ' (سووینیر) مرتب: طارق فار قلیط فلاحی۔ ناشر: شعبہ نشرواشاعت' جماعت اسلامی (ہند) اترپردیش' دارالاسلام مولوی گنج لکھنؤ۔ صفحات: ۹۸۔ قیمت: درج نہیں۔

بھارت کے صوبے اترپردیش کی آبادی ساڑھے پندرہ کروڑ ہے۔ آبادی کے لحاظ سے دنیا کے چھٹے ملک کے برابر! یہاں جماعت اسلامی نے ۲۴ تا ۲ نومبر ۹۶ ہفتہ تعارف قرآن کے دوران سیمی نار' کانفرنس' ریلی اور دوسرے پروگراموں کے ذریعے وسیع پیانے پر قرآن کے ہندی ترجمے کی اشاعت کی۔ زیر تبصرہ سووینیر

اس کی رپورٹ اور قرآن پر چند معیاری مضامین کا مجموعہ ہے۔ ہفتے کے دوران چار سو مقامات پر پروگرام ہوئے۔ تقریباً ایک لاکھ افراد تک جن میں ۸۰ ہزار غیر مسلم تھے' پیغام پہنچایا گیا۔ اس کے لیے فنڈ عام مسلمانوں سے جمع کیا گیا جنھوں نے قرآن ہدیہ دینے کے لیے خوشی خوشی کوپن خریدے۔ اس تعارف کے نتیجے میں جہاں غیر مسلموں کے اندر قرآن کی طرف رجوع ہوا' خود مسلمانوں میں قرآن کو سمجھنے کی طرف توجہ ہوئی ہے کہ غیر مسلموں کو دے رہے ہیں' خود تو جانیں کہ قرآن کو اختیار کرنے کی ضرورت غیر مسلموں سے پہلے مسلمانوں کو ہے۔ مسلمان جانتے ہیں کہ ان کے زوال کا سبب ترک قرآن ہے۔ ان کی عظمت کا راستہ قرآن سے گزر کر ہی جاتا ہے۔ اس مہم سے جماعت کے کارکنوں کے سامنے کام کا وسیع میدان کھل گیا ہے۔ اترپردیش میں جماعت اسلامی کے ایک ہزار ارکان' ۲ ہزار کارکن اور ۲۵ ہزار متفقین ہیں۔ مردوں کے لیے تعلیم بالغاں کے ۵۰ اور لڑکیوں کے لیے ۵۳ مراکز ہیں۔ تعلیمی ادارے لڑکوں کے لیے ۲۳ اور لڑکیوں کے لیے ۵۳ ہیں۔ (مسلم سجاد)

الجامع فی الحدیث ' امام حافظ عبداللہ بن وہب بن مسلم القرشی' محقق: ڈاکٹر مصطفیٰ حسن حسین محمد ابو الخیر۔ ناشر: دار ابن الجوزی' دمام' سعودی عرب۔

امام ابن وہب (عبداللہ بن وہب بن مسلم المصری القرشی الفہری' ابو محمد ۱۹۷ھ) کا شمار دوسری صدی کے ائمہ اجل اور امام مالکؒ کے ممتاز تلامذہ میں ہوتا ہے۔ امام صاحب سے استفادے کی نیت سے آپ نے مصر سے سفر کرتے ہوئے ۲۴ حج کیے۔ امام مالکؒ نے آپ کے بارے میں رائے دی: "ابن وہب امام و عالم ہیں"۔ امام احمد بن صالح نے فرمایا: "امام ابن وہب کی روایت کردہ احادیث کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار ہے' حجازیوں' شامیوں' اور مصریوں میں ان سے زیادہ حدیث کا کوئی عالم نہیں ہے"۔ آپ نے مزید فرمایا: "اللہ تعالیٰ کی وسیع سلطنت میں امام ابن نافع اور امام ابن وہب سے بڑھ کر کوئی عظیم نہیں ہے"۔ امام ابن وہب کا شمار تبع تابعین میں ہوتا ہے۔ آپ نے امام ہشام ابن عروہ تابعی کی زیارت کا شرف حاصل کیا۔ آپ نے عراق' مصر و حجاز کے ۴۰۰' ائمہ اجل سے استفادہ کیا اور ائمہ و محدثین کی ایک کثیر تعداد نے آپ سے فیض حاصل کیا۔

امام ابن وہب کی کثیر تصنیفات میں سے ہمارے علم کی حد تک اب تک ایک مختصر سی کتاب "القدر" ہی زیور طبع سے آراستہ ہوئی ہے اور بقیہ کتابیں مفقود ہیں یا پھر مخطوطات کے کتب خانوں میں بند پڑی ہیں۔

خدا کا شکر ہے ڈاکٹر مصطفیٰ حسن ابو الخیر کو توفیق ہوئی کہ انھوں نے جامعہ ازہر سے ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کرنے کے لیے امام ابن وہب کی ایک اہم کتاب = "الجامع فی الحدیث" کو منتخب کیا اور تیسری صدی

ہجری کے اس واحد مخطوطے کو اپنی تحقیق و تبییض کا مرجع بنایا۔ اس طرح "موطا امام مالک" (دوسری صدی ہجری) کے قریبی دور کی، حدیث کی یہ قدیم کتاب جدید تحقیقی اصولوں کے ساتھ مرتب ہو کر پہلی مرتبہ منظر عام پر آئی ہے۔ اس کتاب میں جملہ ۱۷۷ احادیث پائی جاتی ہیں۔ ان کی سند عالی ہے۔ محقق نے ہر حدیث کی تخریج کی، دوسری کتب حدیث سے ان کا مقارنہ کیا ہے اور رجال حدیث پر احکامات کو حوالے کے ساتھ نقل کیا ہے۔

یہ کتاب اہل علم کے لیے ایک تحفہ ہے۔ ہمیں امید رکھنی چاہیے کہ عالم عرب میں طلبہ و علما کی کتابوں میں دلچسپی سے جس طرح مدفون خزانے ظہور پذیر ہو رہے ہیں، یہ دلچسپی کبھی نہ کبھی برعظیم ہندو پاکستان میں بھی پیدا ہو گی۔ (عبدالمتین منیری)

خونی لکیر، صغیر قمر۔ ناشر: پیرا میڈیا کمیونی کیشن، راولپنڈی۔ صفحات: ۱۳۲۔ قیمت: ۱۳۰ روپے۔

افسانوں کا یہ مجموعہ اس حقیقت کو اجاگر کرتا ہے کہ قوموں کی زندگی میں وہی لوگ قوم کی آنکھ کا تارا بنتے ہیں جنھیں آزادی، اپنے جان و مال سے زیادہ عزیز ہو اور صفحہ ہستی پر صرف وہی قوم زندہ رہ سکتی ہے جسے اپنی آزادی کی قدر و قیمت معلوم ہو اور وہ زندگی اور موت کا مفہوم بھی سمجھتی ہو۔ ان افسانوں میں صغیر قمر نے قائداعظمؒ کے اس فرمان کو روشن اور عیاں تر کیا ہے کہ کشمیر کی آزادی پاکستان کے لیے شہ رگ سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔

کشمیر کے حوالے سے لکھنے والوں میں صغیر قمر کا نام بہت نمایاں ہے۔ وہ ایک عرصے سے قلمی جہاد میں مصروف ہیں۔ ان کے افسانے جہاں فن کی کسوٹی پر پورے اترتے ہیں وہاں ایسی حقیقتوں کو اجاگر کرتے ہیں جو قاری میں ذوق شہادت کو بیدار کرتی ہیں اور جذبہ جہاد کو اور زیادہ جلا دیتی ہیں۔ ان افسانوں کو پڑھتے ہوئے لگتا ہے کہ یہ غاصب ہندوؤں کے تسلط کے خلاف مجاہدوں کی تگ و تاز کی حقیقی داستانیں ہیں۔ کتاب میں ایسی رنگین تصاویر کو بھی شامل کیا گیا ہے جو کشمیریوں اور مجاہدین پر بھارتی حکمرانوں کے تشدد کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ اس جدت (یا "بدعت") نے اسے زندگی اور حقیقت کے اور قریب کر دیا ہے۔ یہ افسانے ذوق عمل کو ابھارتے ہیں۔ بقول بشریٰ رحمٰن: "ان افسانوں کی بنیاد ہی ایک ایمان کامل پر ہے--- یہ افسانے مسجدوں کے گنبدوں سے نکلنے والی صدا کی طرح ضمیر کو جگاتے اور بھلائی کی طرف بلاتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں"۔ کتاب پر بعض معروف اہل قلم عطاء الحق قاسمی، بشریٰ رحمٰن، مجیب الرحمٰن شامی اور لیاقت بلوچ کے توصیفی تاثرات بھی شامل ہیں۔ (عبداللہ شاہ ہاشمی)

ماہنامہ **رفیق منزل**، مسلم تعلیمی تحریکات و شخصیات نمبر (مئی، جون ۱۹۹۷)، مدیر: ایاز احمد اصلاحی۔ پتہ: ۲۳۰، ابو الفضل انکلیو، اوکھلا، نئی دہلی ۲۵۔ صفحات: ۱۴۴۔ قیمت: ۲۵ روپے۔

امت مسلمہ کی روحانی و مادی اور تہذیبی و تمدنی تعمیر و ترقی میں علم و دانش اور تعلیم و تعلم کو خشت اول کی حیثیت حاصل ہے۔ حصول علم کے لیے ہادی اعظمؐ کی تاکید و فکر مندی مسلم ہے۔ مسلمان، بساط عالم پر، اسی حکمت اور علمی برتری کے سبب ہی ایک عظیم عالمی قوت بن کر ابھرے اور یورپ کی ترقی کا راز بھی اسی نکتے میں مضمر ہے۔ بقول اقبال۔

قوت افرنگ از علم و فن است	از ہمیں آتش چراغش روشن است

مگر یہ کیسا المیہ ہے کہ العلم سلاحی کی علم بردار قوم، آج حد درجہ علمی و تعلیمی پسماندگی کا شکار ہے اور یہی اس کے سیاسی، معاشی اور تمدنی انحطاط کا بنیادی سبب ہے۔ "رفیق منزل" کی زیر نظر اشاعت، تعلیم کی تاریخ اور مباحث پر ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہم نے کیا کچھ کیا؟ (دیوبند، علی گڑھ، جامعہ ملیہ، عثمانیہ، مدرسۃ الاصلاح، ندوہ، جامعہ ہمدرد، جماعت اسلامی، ایس آئی او Islamic Organization Students' جیسی تعلیمی و علمی تحریکوں اور اداروں کی کاوشیں) اور ہمارے "سلاطین علم" کے علمی نظریات، تعلیمی خدمات اور سرگرمیاں کیا رہیں؟ (شاہ ولی اللہ، محمد قاسم نانوتوی، سرسید، شبلی، فراہی، جوہر، مودودی، ذاکر حسین، ابو الکلام، افضل حسین، حکیم عبدالحمید، علی میاں، سید حامد، سید محمد سلیم اور ڈاکٹر ممتاز احمد خاں)۔ تعلیم کے موضوع پر نظری و عملی مباحث، فلسفہ، افکار، مختلف تعلیمی تجربات، تعلیمی تحریکیں، منصوبے، نصابات اور متنوع تجربات—— غرض تعلیم پر یہ جامع مگر وقیع دستاویز ہے۔ مرتبین کی محنت قابل داد و تحسین ہے۔

سب سے اہم سوال : کیا افراد، ادارے، تحریکیں اور حکومتیں غور کریں گے کہ ہم قوموں کے عروج و زوال میں علم اور تعلیم (فکر، دانش، تحقیق) کو قرار واقعی اہمیت دے رہے ہیں؟ (س - ۵)

فی ظلال القرآن۔ سید قطب شہیدؒ۔ جلد ششم، اردو۔ ترجمہ: سید معروف شاہ شیرازی۔ ادارہ منشورات اسلامی، بالمقابل منصورہ، ملتان روڈ، لاہور۔ صفحات: ۱۱۷۶۔ ہدیہ: ۳۷۵ روپے۔

زیر نظر جلد کے ساتھ فی ظلال القرآن کے اردو ترجمے کی تکمیل ہو رہی ہے۔ (جلد اول پر تبصرہ: ترجمان: اکتوبر ۱۹۹۵) فالحمد للہ علی ذالک۔ اللہ تعالیٰ اسے مترجم کے لیے خیر و برکت اور قارئین کے لیے ذریعہ ہدایت بنائے۔ سورۃ الذاریات سے تا آخر، یہ جلد اچھے معیار پر چھپی ہے۔ ہدیہ بہت مناسب ہے۔ (س - ۵)

مدیر کے نام

سلیم الدین احمد، کراچی

"دارالکفر میں حدود پر عمل کا مسئلہ" (اگست ۹۷) میں سورہ المدثر کی آیات ۴۳، ۴۴ کے حوالے سے لکھا گیا ہے کہ "اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ قیامت کے روز جب کافروں سے سوال ہو گا کہ انھیں دوزخ میں کون سی چیز لے گئی تو وہ جواب میں کہیں گے کہ ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہ تھے اور مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے"۔ کیا کفر کے باوجود نماز پڑھ کر اور کھانا کھلا کر جنت میں جایا جا سکتا ہے۔ یہ سوال صرف ایمان لانے والوں سے ہی کیا جا سکتا ہے اور یہ جواب صرف ایمان لانے والے ہی دے سکتے ہیں۔ کافروں کے دوزخ میں جانے سے نہ کسی کو تعجب ہو گا اور نہ کوئی اس سے سوال ہو گا۔ اس سلسلے میں تفہیم القرآن جلد ششم، ص ۱۵۳، حاشیہ ۲۴ ملاحظہ فرمائیے: "مطلب یہ ہے کہ ہم ان لوگوں میں سے نہ تھے جنھوں نے خدا اور اس کے رسولؐ اور اس کی کتاب کو مان کر خدا کا وہ اولین حق ادا کیا ہو جو ایک خدا پرست انسان پر عائد ہوتا ہے، یعنی نماز۔ اس مقام پر یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ نماز کوئی شخص اس وقت تک پڑھ ہی نہیں سکتا جب تک وہ ایمان نہ لایا ہو۔ اس لیے نمازیوں میں سے ہونا آپ سے آپ ایمان لانے میں سے مستلزم ہے۔ لیکن نمازیوں میں سے نہ ہونے کو دوزخ میں جانے کا سبب قرار دے کر یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ ایمان لا کر بھی آدمی دوزخ سے نہیں بچ سکتا اگر وہ تارک نماز ہو"۔

عبدالقدیر سلیم، کراچی

سودی معیشت اور بنک کاری اور اسلام کی بے سودی معیشت اور بنک کاری کو ساتھ ساتھ چلانا بظاہر تو شتر گربگی محسوس ہوتا ہے۔ ہمارے آج کے بیشتر علماے معاشیات نے بنک کو مضاربہ کے ذریعے چلانے کا مشورہ دیا ہے، جسے پروفیسر خورشید بھی قبول کرتے ہیں۔ لیکن اس کے علاوہ بھی سود سے پاک بنک کاری کے لیے متبادل راستے ہو سکتے ہیں، مثلاً بنک، شیئر مارکیٹ میں حصص کے کاروبار سے بھی نفع کما سکتے ہیں اور خود بھی صنعت کے میدان میں قدم رکھ سکتے ہیں، اگرچہ اس میں گوناگوں پیچیدگیاں اور دشواریاں اور طوالت ہو گی، لیکن جہاں ارادہ ہو، وہاں راستے نکل ہی آتے ہیں۔ بنکوں کے لیے حاصل شدہ سرمائے سے فائدہ اٹھانے (اور کھاتے داروں کو فائدہ پہنچانے) کا ایک سادہ اور نسبتاً آسان راستہ تجارت کاری (trading) ہے، جس میں صنعت کاری کے برخلاف کسی بھی مدت کے لیے سرمایہ نہیں پھنستا، بلکہ چند ماہ، یا چند ہفتوں ہی کی خرید و فروخت (اندرون ملک یا درآمد / برآمد کے ذریعے) سے دیانت اور ایمان داری کے ساتھ ربوا سے پاک سرمایہ کاری اور نفع ممکن ہے۔ ان صورتوں کا

پروفیسر صاحب کے مقالے میں ذکر نہیں' لیکن یہ سرمائے کی گردش کی ممکن مفید صورتیں ہو سکتی ہیں۔ بنگلہ دیش میں "گرامین بنک" کے نام سے جو تجربہ ہوا ہے' میری اطلاع کے مطابق خاصا کامیاب ہے۔ اس کے ذریعے چھوٹے کاروباری خواتین و حضرات کو بنک قرض دیتا ہے۔ واپسی کی شرح نہ صرف ہمارے بنکوں کے بھاری قرضوں سے بہتر ہے' بلکہ اس کے ذریعے نفع بھی قابل اطمینان ہے' جو بنک کے پھلنے پھولنے کا باعث ہے' اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس کے ذریعے بے وسیلہ' مگر محنتی اور کچھ کرنے کے آرزومند لوگوں کے معاش کے ابواب کھلتے ہیں' جو اسلامی فلسفہ معیشت کے عین مطابق ہے' کیونکہ اصلاً اسلام کا منشا ہی یہ ہے کہ دولت گردش میں رہے' اس سے لوگوں کی احتیاجات پوری ہوں' اور مزید پیداوار میں مددگار ہو' نہ یہ کہ اس کے ذریعے ارتکازات زر وجود میں آئیں۔

میاں غلام ربانی' مانسہرہ

"اسلامی بنک کاری" (جولائی ۹۷) پڑھ کر چراغ راہ کا قانون نمبر یاد آیا جو میں نے کئی سال قبل ایک صاحب سے لے کر مطالعہ کیا تھا مگر اب نایاب ہے۔ اس کو سلسلہ وار ترجمان میں شائع کریں یا اس کی اشاعت نو کریں۔ نیز ترجمان کے اسلامی بنک کاری نمبر' جہاد نمبر' سیاست نمبر وغیرہ شائع کیے جائیں تو یہ ایک بڑی خدمت ہو گی۔ عصر حاضر میں نسل نو کی رہنمائی کی توقع آپ ہی سے ہے۔ ترجمان نے ہمیشہ جذباتیت کے بجائے شواہد و استدلال کی روشنی میں لکھا ہے۔

محمد رضی الاسلام ندوی' علی گڑھ

ترجمان یہاں ادارہ تحقیق میں آتا ہے۔ مطالعے کو مل جاتا ہے۔ مرحوم خرم مراد صاحب نے (اللہ انھیں غریق رحمت کرے) اسے جو نیا رنگ و آہنگ دیا تھا' یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے کہ وہ برقرار ہے' اور اس میں ادنیٰ سا بھی فرق نہیں آیا ہے۔ اس کے متنوع دینی مضامین علمی اور تحریکی دونوں ضرورتوں کو باحسن طریق پورا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی کوششوں کو شرف قبولیت سے نوازے۔

مولانا محمد حسن جان' پشاور کینٹ

بلاشبہ رسالہ نہایت معیاری ہے اور بلند پایہ مضامین' اور عالمی و سیاسی فکری مسائل کا حسین مرقع اور اصلاح و تربیت کا ذریعہ ہے۔

رشید احمد انگوی' لاہور

اگست کا شمارہ عجیب محسوس ہوا کہ وطن عزیز کی گولڈن جوبلی کی اس میں کوئی جھلک نہیں--- سوائے آزادی کے حوالے سے ایک مضمون کے! تعجب ہے!!

44

سید مودودیؒ انسٹی ٹیوٹ

پاکستانی طلبہ کا داخلہ

• میٹرک فرسٹ ڈویژن اور ایف۔اے پاس طلبہ داخلہ لے سکتے ہیں

ذریعہ تعلیم انگلش اور عربی ہے

پانچ سالہ ڈگری کورس قرآن' تفسیر' حدیث' فقہ' اسلامی تاریخ' اکنامکس' پولٹیکل سائنس' ایجوکیشن' نفسیات' سوشیالوجی' دور حاضر کی اسلامی دنیا' تحریکات اسلامی' منطق' فلسفہ' بلاغت' عربی ادب' اور صرف و نحو کے علاوہ بی اے تک مروج انگریزی نصاب۔

فراغت کے بعد **كلية الشريعة والثقافة** سے بی اے کی ڈگری دی جاتی ہے جسے پنجاب یونیورسٹی نے بی اے کی ڈگری کے مساوی قرار دیا ہے۔

عربی سکھانے کے لیے عرب اساتذہ

31 جولائی 1997ء تک درخواستیں دی جا سکتی ہیں۔ 11 اگست 1997ء کو داخلہ ٹیسٹ ہو گا۔
فیس داخلہ ایک ہزار (-/1000) روپے ہو گی۔ ماہانہ فیس -/400 روپے اور
ہوسٹل کا ماہانہ کرایہ -/400 روپے ہو گا۔ اخراجات طعام -/600 روپے ماہانہ اندازا

رجسٹرار
سید مودودی انسٹی ٹیوٹ
وحدت روڈ لاہور 54570' فون: 5416694 - 5413517

لٹریچر کا روزانہ کچھ نہ کچھ مطالعہ اپنی عادت بنایئے!

ہر کارکن کے لیے سرمایہ علم و عمل' راہ نما کتاب

مولانا صدر الدین اصلاحی

"اساس دین کی تعمیر"

کا مطالعہ کیجیے

ملک بھر کے تحریکی مکتبوں سے حاصل کیجیے

عطیہ اشتہار:

SEARS International
COMPUTERS, PRINTERS & MONITORS
58, First Floor, Hafeez Centre, Gulberg III, Lahore. Pakistan.
Tel: 92-42-5752247-48, Fax: 92-42-5752249

ہماری مطبوعات

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ

سلاجقہ — 28:00
دکن کی سیاسی تاریخ — 28:00

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ

مرتب: نعیم صدیقی، عبدالوکیل علوی

یہودیت قرآن کی روشنی میں — 85:00
نصرانیت قرآن کی روشنی میں — 75:00

مولانا جلیل احسن ندویؒ

سفینہ نجات — 80:00

سید قطب شہید

معرکہ اسلام اور سرمایہ داری — 24:00

حیدر زمان صدیقی

اسلامی نظریہ اجتماع — 34:00
اسلام کا نظریہ جہاد — 24:00
تعمیری انقلاب اور قرآنی اصول حکمت — 24:00
عہد نبوت کے مسائل اور عصر حاضر — 5:00

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ

مرتب: سید اسعد گیلانی

حکمت تبلیغ — 80:00
اسلام اور مسلم خواتین — 30:00
دعوت و تنظیم — 30:00

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ

مرتب: اختر حجازی

دارالاسلام — 125:00
استفسارات (حصہ اول) — 75:00
استفسارات (حصہ دوم) — 70:00
تفہیمات (حصہ چہارم) — 60:00
تفہیمات (حصہ پنجم) — 66:00

خطبات یورپ — 90:00
قوموں کے عروج و زوال پر علمی تحقیقات کے اثرات (مجلد) — 35:00

سید اسعد گیلانی

خطبات انبیاء — 24:00
رسول اکرمؐ کی حکمت (تبلیغ) (مجلد) — 120:00
حضور اکرمؐ اور ہجرت — 45:00
قرآن، رمضان اور محرم — 21:00
تحریک اسلامی کی پہلی کتاب — 36:00
تحریک اسلامی کی دوسری کتاب — 46:00
اسلام اور سوشلزم — 36:00
دوش بدوش — 46:00
اسلامی نظریہ ادب (مجلد) — 30:00
امت مسلمہ سے خطاب — 7:50
تحریک اسلامی کا تعارف — 1:00
مولانا مودودیؒ: بچپن، جوانی، بڑھاپا (مجلد) — 40:00

ام فاروقؒ

رسول اکرمؐ — 48:00

فرزانہ حسن

ازواج مطہراتؓ — 30:00

مولانا محمد یوسف اصلاحی

برائیوں کے طوفان میں آپ کیا کریں؟ — 6:75

عبدالکریم عابد

مولانا مودودی کے سیاسی افکار — 24:00

شبیر احمد منظر قدوسی

اقامت دین کا کام کہاں اور کیسے ہو؟ — 5:00

ڈاکٹر محمد امین

عصر حاضر اور اسلام کا نظام قانون — 60:00
جسٹس تنزیل الرحمٰن کے اہم فیصلے — 2:25

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیوٹ) لمیٹڈ، رحمٰن مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

C .P.L. 236

Phone : 7587916
7585590

Monthly **TARJUMAN-UL-QURAN** LAHORE,